صفر المظفر ۱۴۴۵ھ
ستمبر ۲۰۲۳ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- بقائے پاکستان: نفاذِ عدلِ اسلام
- اِحیائی تحریکات کی عمر اور تنظیم اسلامی
- برِّصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد اور اِحیائی فکر کا ارتقاء

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

خوبصورت ٹائٹل ● سفید کاغذ ● معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں
(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)
مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید
قرآنی رسم الخط ● تفسیری سائز ● عمدہ سفید کاغذ ● مضبوط مراکو جلد
2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں
مکمل سیٹ کی قیمت: 9600 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد : 72

شمارہ : 9

صفر المظفّر 1445ھ

ستمبر 2023ء

فی شمارہ : 50روپے

سالانہ زرِتعاون : 500روپے

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:
ایوب بیگ مرزا' خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:
حافظ محمد زاہد' محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ''دارُالاسلام'' ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ـــــ 5

''بقائے پاکستان: نفاذِ عدلِ اسلام'' — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ـــــ 9

سورۃ الدھر — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دفاعِ وطن ـــــ 19

جنگ ستمبر: تجزیہ اور تجاویز — سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

گاھے گاھے باز خواں ـــــ 23

برصغیر پاک وہند میں اسلام کی آمد.... (۲) — قیصر جمال فیاضی

دعوت و تحریک ـــــ 38

احیائی تحریکات کی عمر اور تنظیم اسلامی — عبدالروٴف

تذکیر و موعظت ـــــ 47

توکّل علی اللہ کی برکات — حافظ محمد اسد

حسنِ معاشرت ـــــ 53

تکبّر: اسباب وعلاج — احمد علی محمودی

تعمیرِ سیرت ـــــ 68

طلبہ کی کردار سازی — ڈاکٹر عامر عتیق صدیقی

انوارِ ھدایت ـــــ 73

جنتی کون' دوزخی کون؟ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ظروف و احوال ـــــ 78

اسکوفیلڈ بائبل — رضی الدین سید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

”بقائے پاکستان: نفاذِ عدلِ اسلام“

پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے ہوئے ۷۶ سال مکمل ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک یہ بحث چل رہی ہے کہ پاکستان کے قیام کا اصل مقصد کیا تھا! پاکستان کیوں معرض وجود میں آیا؟ اس کی بنیاد کیا تھی؟ اگرچہ نہ صرف مذہبی طبقہ بلکہ عوام کی عظیم ترین اکثریت بھی اس بات کو مانتی ہے کہ پاکستان کے وجود کی بنیاد ”لا الٰہ الا اللہ“ تھی۔ لیکن ایک بااثر اقلیت کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کو کوئی اسلامی ریاست بنانا مقصود نہیں تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کا ایک ملک حاصل کرنا اس لیے تھا کہ انہیں ہندو سے خطرہ تھا کہ وہ ان کا اقتصادی اور سماجی استحصال کریں گے۔ اس کا بڑا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ جب آپ خود مانتے ہیں کہ استحصال کی وجہ مذہبی تھی تو بات واضح ہو گئی کہ پاکستان مذہب کی بنیاد پر بنا تھا۔

دراصل پاکستان بننے کے بعد سارا معاملہ ہمارے اپنوں نے ہی خراب کیا ہے۔ جسٹس منیر نے ایک کتاب لکھی: Jinnah to Zia۔ اس میں وہ قائداعظم کی ۱۱/اگست ۱۹۴۸ء کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایک سیکولر ریاست کا قیام مقصود تھا۔ اس تقریر کے حوالے سے ریڈیو پاکستان سے معلومات حاصل کی گئیں تو بتایا گیا کہ ایسی کوئی تقریر وہاں موجود نہیں۔ حکومتی سطح پر بھارت سے رابطہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ آل انڈیا ریڈیو کے ریکارڈ میں بھی ایسی کوئی تقریر موجود نہیں۔ اللہ جانے جسٹس منیر کہاں سے وہ تقریر نکال لائے! برطانیہ کی ایک خاتون سلینا کریم نے وہاں کی تمام لائبریریوں کو چھان ڈالا مگر وہ تقریر نہ مل سکی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک کتاب لکھی:

Secular Jinnah & Pakistan : What the Nation Does not Know

اس کے صفحہ ۱۵۱ پر انہوں نے لکھا کہ جسٹس منیر نے ۱۱/اگست کی تقریر کے حوالے سے جو کچھ لکھا

وہ سب من گھڑت ہے۔ چنانچہ جب بنیاد پر ہی اتفاق نہ ہو سکا تو استحکام کیسا! دنیا میں اپنی پہچان کیسے قائم کر سکتے ہیں۔

اسی لیے تنظیم اسلامی نے ۱۱/اگست ۲۰۲۳ء سے مہم شروع کی ہے‘ جس کا نام رکھا ہے ”بقائے پاکستان: نفاذِ عدلِ اسلام“۔ پہلے حصے کا جواب دوسرے حصے میں ہے کہ بقائے پاکستان نفاذِ عدلِ اسلام میں ہے۔ عدل اسلام کا کیچ ورڈ ہے۔ اسلام عدل کے حوالے سے کوئی تمیز روا نہیں رکھتا۔ اگر اسلام میں سے عدل نکال لیا جائے تو اس میں رہ کیا جاتا ہے؟ آج کی دنیا میں امریکہ اور یورپ نے عدل کو اپنے مفادات کے تابع کیا ہوا ہے۔ ان کا ایمان اپنی قومیت پر ہے‘ اپنے مفادات پر ہے۔ جو بات ان کے مفاد کے مطابق ہے وہ عدل ہے جبکہ جو بات ان کے مفاد کے مطابق نہیں وہ عدل نہیں ہے۔ اپنے اندرونی معاملات میں ان کے ہاں شاید عدل ہو گا لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ جب وہ بیرونی دنیا سے معاملات کرتے ہیں تو کیا عدل سے کام لیتے ہیں؟ دراصل کوئی جھوٹ بولنا پڑ جائے‘ کوئی بد دیانتی کرنی پڑ جائے اور وہ قوم و ملک کے مفاد میں ہو تو ان کے نزدیک عدل ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے مفاد کو سامنے رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص یا جماعت بقائم ہوش وحواس عدل سے انکار نہیں کر سکتی۔ اسی لیے ہم نفاذِ عدل کی بات کر رہے ہیں۔ عدل کی پہچان اس کی تنفیذ میں ہے۔ مریض اگر ڈاکٹر کے نسخے کو دس بار پڑھتا ہے‘ اس کو سنبھال کر رکھتا ہے‘ لیکن استعمال نہیں کرتا تو اس کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اسی طرح اگر عدل کا نفاذ نہیں ہوتا تو وہ محض کتابوں تک ہی محدود ہو کر رہ جائے گا۔ معاشرے کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکے گا۔

انسانی زندگی کے اجتماعی گوشوں یعنی معاشرت‘ معیشت اور سیاست میں عدل کا نفاذ ہونا چاہیے۔ معاشرت میں جہاں تک فرد اور خاندان کا تعلق ہے تو اس میں معاملہ ترغیبات‘ اخلاقیات اور روایات پر چلے گا۔ جبکہ قانون کا عنصر بہت کم ہو گا۔ جہاں تک معیشت اور سیاست کا تعلق ہے تو اس میں قانون کا بہت عمل دخل ہو گا۔ اس وقت دنیا میں معاشی سطح پر بے ہنگم سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے جو کہ اسلام کی مکمل ضد ہے۔ اسلام سرمایہ کاری کا قائل ہے‘ سرمایہ داری کا نہیں۔ امریکہ‘ یورپ وغیرہ سرمایہ دارانہ نظام کو اپنی ضرورت اور مفادات کے مطابق ڈھال کر استعمال کرتے ہیں‘ اگرچہ قومی سطح پر اس کی اصلاح بھی کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے اس استحصالی نظام

میں مزید بگاڑ پیدا کر کے اپنے اوپر مسلط کیا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر سرمایہ داروں کو ساری دنیا میں مراعات اور رعایتیں دی جاتی ہیں لیکن ہم نے تو انہیں خدا بنا رکھا ہے۔ ان کے لیے ایمنسٹی اسکیمیں' بالواسطہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں جن کا بوجھ براہِ راست عوام پر آتا ہے۔ یوں بے چارے عوام پستے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جج کی ماہانہ تنخواہ ۱۲ لاکھ روپے ہے اور اس کے ساتھ دوسری مراعات بھی ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ماہانہ پنشن بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ دوسری طرف حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر نچلے طبقے کی تنخواہ ۳۲ ہزار کر دی گئی ہے۔ یہ تفاوت اور فرق اصل میں معاشی سطح پر ظلم ہے۔

یہ ظلم ہمیں اُس وقت تک سہنا ہوگا جب تک ہم نفاذِ عدل کے حوالے سے کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے۔ سیاست کا حال اس سے بھی برا ہے۔ حال ہی میں ایک ایڈیشنل سیشن جج کی اہلیہ نے اپنی گھریلو ملازمہ پر اتنا خوف ناک اور بہیمانہ تشدد کیا ہے جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ظلم صرف ایک شعبے میں نہیں ہو رہا بلکہ پورے کا پورا نظام ہی عدل کے خلاف کھڑا ہے۔ فرض کریں جس عورت نے ملازمہ پر ظلم کیا ہے' کل کلاں اس پر مقدمہ چلایا جاتا ہے' کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا ہے اور سوالات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے۔ جواب میں وہ عورت کہتی ہے کہ ٹھیک ہے' مجھ سے ایک جرم ہوا ہے' مَیں مانتی ہوں کہ مجھ سے قانون شکنی ہوئی' مَیں اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں' لیکن اس نظام کے کارپردازوں' ٹھیکے داروں اور بڑوں نے تو قوم کے سر سے آئین کی چادر ہی کھینچ لی' حکومتی ذمہ داران نے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کی بدترین انداز میں توہین کی' آئین اور قانون کو بُرے طریقے سے روند ڈالا۔ مجھے سزا دو' ضرور دو' لیکن جنہوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے قانون سازی کی' جنہوں نے قانون اور آئین کے پرخچے اڑا دیے ان کے لیے بھی تو کچھ بولو۔ اب تمہاری زبان گنگ کیوں ہوگئی ہے۔ اب قبرستان جیسی خاموشی کیوں چھا گئی ہے۔ اگر تم قانون اور آئین سے بالاتر ہو تو مَیں کیوں نہیں!

ہم نے بچپن میں ایک واقعہ سنا ہوا ہے کہ ایک خاتون حضرت عمر فاروق ؓ کے پاس ایک بچہ لے کر آئی کہ یہ گڑ کھاتا ہے' اس کو نصیحت کیجیے۔ حضرت عمرؓ نے اس خاتون کو فرمایا کہ کل آ جانا۔ دوسرے دن خاتون آئی تو آپؓ نے اس بچے کو کہا کہ گڑ مت کھایا کرو۔ خاتون بولی کہ اگر آپ نے یہی کہنا تھا تو کل کہہ دیتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کل میں نے خود گڑ کھایا ہوا تھا۔ یہ

ہے اصل بات! یہاں تو یہ ہو رہا ہے کہ خود کرتے ہیں تو وہ عدل ہے اور دوسرا کرے تو وہ ظلم قرار پاتا ہے۔ ہماری رائے میں عدل ایسی شے نہیں کہ جہاں چاہا اس کا ٹھپا لگا دیا اور جہاں چاہا صرفِ نظر کر لیا۔ کبھی عدل کی کرسی پر جلوہ افروز ہوگئے اور کبھی ظالم کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوگئے۔ اگر نظام ایسا ہی رہا تو کوئی نہ کوئی رضوانہ روز ظلم کا شکار ہوتی رہے گی۔ یہ نظام کا قصور ہے۔ صاحب حیثیت جو خود نہیں کرتے وہ دوسروں سے توقع رکھتے ہیں۔ سب قانون کو مانو' سب قانون کی پاس داری کرو۔

اصل میں ہمارے ہاں ایک غلطی شروع سے ہوئی ہے کہ قومی جماعتیں اور مذہبی جماعتیں ایک دوسرے سے تعاون نہیں کر سکیں۔ ہم کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے۔ مولانا مودودیؒ نے پاکستان کے بننے سے پہلے قائداعظم کی ذات پر اور مسلم لیگ پر بھی زبردست حملے کیے تھے۔ یہ سب انہوں نے نیک نیتی سے کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ راستہ ٹھیک نہیں' دوسرا راستہ ٹھیک ہے۔ اُس کے باوجود قائداعظم نے پاکستان بننے کے بعد پہلے دن ہی مولانا مودودیؒ سے فرمائش کی کہ ریڈیو پاکستان پر آئیں اور لوگوں کو اسلام کے حوالے سے بتائیں۔ قائداعظم کی وفات کے بعد قومی جماعتیں اور مذہبی جماعتیں آپس میں وہ تعاون نہ کر سکیں جو ملک کو آگے بڑھانے اور اسلام کی طرف پیش رفت کرنے کے لیے انہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اس میں دونوں قصوروار ہیں۔ خاص طور پر جب مذہبی جماعتیں باقاعدہ انتخابات میں کود گئیں تو ان کا قصور مزید بڑھ گیا۔ ہم سیاست کے مخالف نہیں' لیکن جب آپ کا مقصد اسلام نافذ کرنا ہے تو پھر انتخابی سیاست کا راستہ موزوں نہیں۔ پاکستان کے معروضی حالات میں انتخابات کے ذریعے کوئی انقلابی تبدیلی ممکن ہی نہیں۔

اسلام کا نفاذ صرف حکومت کا فرض نہیں ہے۔ یہ صرف کسی دینی جماعت کا بھی فرض نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا فرض ہے جو پاکستان کے ہر مسلمان پر عائد ہوتا ہے کیونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ آپ دیکھیں کہ کون سی دینی اجتماعیت نفاذِ اسلام کے حوالے سے زیادہ بہتر کام کر رہی ہے' اس میں شامل ہو جائیں۔ کوئی کسی بھی جماعت میں ہو لیکن نفاذِ اسلام کے لیے جِدّوجُہد کرنا سب کا فرض ہے۔ اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ فرض کیجیے ہم کل صبح اٹھتے ہیں اور پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست بن چکا ہوتا ہے۔ (باقی صفحہ 82 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن
ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الدَّھْر

سورۃ الدھر اور سورۃ القیامہ کے مابین جوڑے کا تعلق ہے۔ اس تعلق کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ دونوں سورتیں مضمون کے تسلسل کی بنا پر باہم جڑی ہوئی ہیں۔ سورۃ القیامہ کا اختتام انسان کی تخلیق کے ذکر سے ہوا اور اسی مضمون سے سورۃ الدھر کا آغاز ہو رہا ہے۔

آیات ۱ تا ۲۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡـًٔا
مَّذۡکُوۡرًا ۝۱ اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ ٭ نَّبۡتَلِیۡهِ
فَجَعَلۡنٰهُ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ۝۲ اِنَّا هَدَیۡنٰهُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا
کَفُوۡرًا ۝۳ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ سَلٰسِلَا۠ وَ اَغۡلٰلًا وَّ سَعِیۡرًا ۝۴ اِنَّ
الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ کَاۡسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوۡرًا ۝۵ عَیۡنًا
یَّشۡرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوۡنَهَا تَفۡجِیۡرًا ۝۶ یُوۡفُوۡنَ بِالنَّذۡرِ
وَ یَخَافُوۡنَ یَوۡمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسۡتَطِیۡرًا ۝۷ وَ یُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی
حُبِّهٖ مِسۡکِیۡنًا وَّ یَتِیۡمًا وَّ اَسِیۡرًا ۝۸ اِنَّمَا نُطۡعِمُکُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِیۡدُ
مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّ لَا شُکُوۡرًا ۝۹ اِنَّا نَخَافُ مِنۡ رَّبِّنَا یَوۡمًا عَبُوۡسًا
قَمۡطَرِیۡرًا ۝۱۰ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِکَ الۡیَوۡمِ وَ لَقّٰهُمۡ نَضۡرَةً
وَّ سُرُوۡرًا ۝۱۱ وَ جَزٰهُمۡ بِمَا صَبَرُوۡا جَنَّةً وَّ حَرِیۡرًا ۝۱۲ مُّتَّکِـِٕیۡنَ فِیۡهَا
عَلَی الۡاَرَآئِکِ ۚ لَا یَرَوۡنَ فِیۡهَا شَمۡسًا وَّ لَا زَمۡهَرِیۡرًا ۝۱۳ وَ دَانِیَةً

عَلَیۡهِمۡ ظِلٰلُهَا وَ ذُلِّلَتۡ قُطُوۡفُهَا تَذۡلِیۡلًا ۝۱۴ وَ یُطَافُ عَلَیۡهِمۡ بِاٰنِیَةٍ
مِّنۡ فِضَّةٍ وَّ اَکۡوَابٍ کَانَتۡ قَوَارِیۡرَا۠ ۝۱۵ قَوَارِیۡرَا۠ مِنۡ فِضَّةٍ
قَدَّرُوۡهَا تَقۡدِیۡرًا ۝۱۶ وَ یُسۡقَوۡنَ فِیۡهَا کَاۡسًا کَانَ مِزَاجُهَا
زَنۡجَبِیۡلًا ۝۱۷ عَیۡنًا فِیۡهَا تُسَمّٰی سَلۡسَبِیۡلًا ۝۱۸ وَ یَطُوۡفُ عَلَیۡهِمۡ
وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ۚ اِذَا رَاَیۡتَهُمۡ حَسِبۡتَهُمۡ لُؤۡلُؤًا مَّنۡثُوۡرًا ۝۱۹
وَ اِذَا رَاَیۡتَ ثَمَّ رَاَیۡتَ نَعِیۡمًا وَّ مُلۡکًا کَبِیۡرًا ۝۲۰ عٰلِیَهُمۡ ثِیَابُ
سُنۡدُسٍ خُضۡرٌ وَّ اِسۡتَبۡرَقٌ ۫ وَّ حُلُّوۡۤا اَسَاوِرَ مِنۡ فِضَّةٍ ۚ وَ سَقٰهُمۡ
رَبُّهُمۡ شَرَابًا طَهُوۡرًا ۝۲۱ اِنَّ هٰذَا کَانَ لَکُمۡ جَزَآءً وَّ کَانَ
سَعۡیُکُمۡ مَّشۡکُوۡرًا ۝۲۲

آیت ۱ ﴿هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡکُوۡرًا ۝۱﴾

’’کیا انسان پر اس زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جبکہ وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا؟‘‘

’’دَھر‘‘ سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی نہ ابتدا انسان کو معلوم ہے نہ انتہا' جبکہ ’’حِیْن‘‘ سے مراد وہ خاص وقت ہے جو اس لامتناہی زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو — چنانچہ ’’دَھر‘‘ دراصل وقت کا وہ سمندر ہے جس کے اندر سے کائنات میں رونما ہونے والے ہر قسم کے واقعات و حادثات جنم لیتے ہیں۔ وقت کے اسی سمندر میں سے ہم انسان بھی نکلے ہیں۔ ع ’’قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب‘‘ (اقبال)۔ چنانچہ اس قلزمِ ہستی کے اندر ہر انسان پر ایک وقت ایسا بھی آیا ہے جب اس کا وجود حقیر پانی کی ایک ایسی بوند کی شکل میں تھا جس کا ذکر کرنا اور نام لینا بھی کوئی پسند نہیں کرتا۔

آیت ۲ ﴿اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ ٭﴾ ’’ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے ملے جلے نطفے سے‘‘

موجودہ دور میں سائنس نے اس آیت کا مفہوم بہت اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ مرد کی طرف سے spermatozoon اور ماں کی طرف سے ovum ملتے ہیں تو zygote وجود میں آتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے پندرہ سو سال پہلے صحرائے عرب کا ایک بدو تو لفظ ’’اَمْشَاج‘‘ کو اپنی

سمجھ اور عقل کے مطابق ہی سمجھا ہوگا۔ گویا قرآن مجید کے اعجاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے الفاظ کا مفہوم ہر زمانے کے ہر قسم کے انسانوں کے لیے قابلِ فہم رہا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کے معانی ومطالب میں نئی نئی جہتیں بھی دریافت ہوتی رہتی ہیں۔

﴿نَّبۡتَلِيۡهِ﴾ ’’ہم اس کو اُلٹتے پلٹتے رہے‘‘

یعنی رحمِ مادر میں ہم نے اس ’’نُطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ‘‘ کو مختلف مراحل سے گزارا۔ نطفہ سے اسے عَلَقہ بنایا۔ عَلَقہ کو مُضۡغہ کی شکل میں تبدیل کیا اور پھر اس کے اعضاء درست کیے۔ ’’نَبۡتَلِيۡهِ‘‘ کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے ’’تاکہ ہم اس کو آزمائیں‘‘۔ یعنی ہم نے انسان کو امتحان اور آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے۔

﴿فَجَعَلۡنٰهُ سَمِيۡعًۢا بَصِيۡرًا ۝۲﴾ ’’پھر ہم نے اس کو بنا دیا سننے والا‘ دیکھنے والا۔‘‘

آیت ۳ ﴿اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ﴾ ’’ہم نے اس کو راہ سجھا دی‘‘

اس سے مراد ’’ایمان‘‘ سے متعلق وہ شعور یا وہ ہدایت اور راہنمائی ہے جو ہر انسان کی فطرت کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یعنی انسان اندھا اور بہرہ پیدا نہیں ہوا‘ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہری اور باطنی طور پر بہترین صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ جسمانی حواس بھی دیے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اسے روح کی بصیرت بھی عطا کی ہے۔

﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا ۝۳﴾ ’’اب چاہے تو وہ شکر گزار بن کر رہے‘ چاہے ناشکرا ہو کر۔‘‘

اب ظاہر ہے جس انداز اور طریقے سے انسان زندگی گزارے گا‘ اسی کے مطابق آخرت میں اس کو بدلہ دیا جائے گا۔

آیت ۴ ﴿اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغۡلٰلًا وَّسَعِيۡرًا ۝۴﴾ ’’یقیناً کافروں کے لیے ہم نے تیار کر رکھی ہیں زنجیریں اور طوق اور دہکتی ہوئی آگ۔‘‘

آیت ۵ ﴿اِنَّ الۡاَبۡرَارَ يَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ كَاۡسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوۡرًا ۝۵﴾ ’’یقیناً نیکوکار بندے ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں کافور کی ملونی ہوگی۔‘‘

ایک طرف کُفّار ومشرکین زنجیروں اور طوقوں میں جکڑے جہنّم کی آگ میں جل رہے ہوں گے تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور نیکوکار بندے جنّت کی نعمتوں میں دادِ عیش دے

رہے ہوں گے۔ جنّت میں انہیں آبِ کافور کی آمیزش والی شرابِ طہور بھی پیش کی جائے گی۔ آگے اس چشمۂ کافور کی مزید وضاحت ہے:

آیت ۶ ﴿عَيۡنًا يَّشۡرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوۡنَهَا تَفۡجِيۡرًا ۝۶﴾ ’’یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے اور جدھر چاہیں گے اس کی شاخیں نکال لے جائیں گے۔‘‘

یعنی اگر وہ چاہیں گے تو اس چشمے میں سے اپنی مرضی سے نہریں نکال کر اپنے اپنے علاقے کی طرف لے جائیں گے۔

آیت ۷ ﴿يُوۡفُوۡنَ بِالنَّذۡرِ وَيَخَافُوۡنَ يَوۡمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسۡتَطِيۡرًا ۝۷﴾ ’’وہ نذر کو پورا کرتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں اُس دن سے جس کا شر ہر سُو پھیل جائے گا۔‘‘

آیت ۸ ﴿وَيُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسۡكِيۡنًا وَّيَتِيۡمًا وَّاَسِيۡرًا ۝۸﴾ ’’اور وہ کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین‘ یتیم کو اور قیدی کو۔‘‘

عَلٰى حُبِّهٖ کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ مال کی محبّت کے علی الرغم کھانا کھلاتے ہیں۔ یعنی ایک مفہوم تو یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی محبت میں بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اگرچہ ان کے دلوں میں بھی مال سے محبّت کا جذبہ ہے اور ان کا جی بھی چاہتا ہے کہ وہ اپنے مال کو سنبھال سنبھال کر رکھیں‘ لیکن اپنے ان جذبات کے باوجود وہ محض اللہ کی رضا کے لیے مستحقین کو کھانا کھلانے میں اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ حُبِ مال کا علاج ہی انفاق فی سبیل اللہ ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو قرآن مجید میں جگہ جگہ بشارتیں دی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۃ الحدید کی یہ آیت: ﴿اِنَّ الۡمُصَّدِّقِيۡنَ وَالۡمُصَّدِّقٰتِ وَاَقۡرَضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمۡ وَلَهُمۡ اَجۡرٌ كَرِيۡمٌ ۝۱۸﴾ ’’یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو اللہ کو قرضِ حسنہ دیں‘ ان کو کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزّت اجر ہوگا۔‘‘

آیت ۹ ﴿اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ﴾ ’’(اور کہتے ہیں کہ) ہم تو آپ کو یہ کھانا کھلا رہے ہیں صرف اللہ (کی رضا) کے لیے‘‘

﴿لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ⑨﴾ ''ہم آپ سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکریہ۔''

آیت ۱۰ ﴿اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ⑩﴾ ''ہم تو ڈرتے ہیں اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن سے جس کی اداسی بڑی ہولناک ہوگی۔''

عَبُوْس کا لفظ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہ آتی ہو' بلکہ غصہ اور وحشت برستی ہو۔ جب کہ قَمْطَرِيْر کا معنی ہے بہت سخت' بہت کرخت' ہولناک اور طویل۔ چنانچہ یہاں اس سے مراد میدانِ محشر کی وہ کیفیت ہے جس کی وجہ سے کھرب ہا کھرب انسان متفکر اور پریشان ہوں گے اور ان میں سے کسی ایک کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کے آثار تک نظر نہیں آئیں گے۔

آیت ۱۱ ﴿فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ﴾ ''تو اللہ انہیں بچالے گا اُس دن کے شر سے''

﴿وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ⑪﴾ ''اور بخش دے گا انہیں تروتازگی اور مسرت۔''

یعنی چہروں کی تازگی اور دلوں کا سرور۔

آیت ۱۲ ﴿وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ⑫﴾ ''اور بدلے میں دے گا انہیں ان کے صبر کے سبب جنّت اور ریشم کا لباس۔''

دنیا میں وہ لوگ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں لگے رہے۔ انہوں نے فاقوں سے رہنا گوارا کر لیا لیکن حرام کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے انہوں نے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ ان کے اس صبر کے بدلے میں اللہ تعالیٰ انہیں رہنے کے لیے جنّت اور پہننے کے لیے ریشم کی پوشاکیں عطا کرے گا۔

آیت ۱۳ ﴿مُّتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ﴾ ''وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اس میں تختوں کے اوپر۔''

﴿لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ⑬﴾ ''نہیں دیکھیں گے وہ اس میں دھوپ کی حدت اور نہ سخت سردی۔''

زَمْهَرِيْر ایسی سخت سردی کو کہتے ہیں جو انسان پر زبردست کپکپی طاری کر دے۔ چنانچہ

جنّت میں اہلِ جنّت کو نہ تو دھوپ کی تپش تنگ کرے گی اور نہ ہی انہیں ٹھٹھرنے والی سردی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گویا جنّت میں مسلسل معتدل موسم کا سماں ہوگا۔

آیت ۱۴ ﴿وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا﴾ ''اور جنّت کے سائے ان کے اوپر جھکے ہوئے ہوں گے''

﴿وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ⑭﴾ ''اور اس کے پھلوں کے خوشے نیچے جھکے ہوئے لٹک رہے ہوں گے۔''

آیت ۱۵ ﴿وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۠ ⑮﴾ ''اور گردش میں ہوں گے ان پر (خُدّامِ جنّت) چاندی کے برتنوں اور شیشے کے پیالوں کے ساتھ۔''

آیت ۱۶ ﴿قَوَارِيْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ﴾ ''ایسا شیشہ جو چاندی کا ہوگا''

دراصل وہ آب خورے یا جام انتہائی نفیس اور شفاف (crystal clear) چاندی سے بنے ہوں گے' لیکن دیکھنے میں وہ شیشے جیسے ہوں گے۔

﴿قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ⑯﴾ ''ان کو (ساقیانِ جنّت نے) بھرا ہوگا بھرپور اندازے کے مطابق۔''

آیت ۱۷ ﴿وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ⑰﴾ ''اور ان کو پلایا جائے گا اس میں ایسا جام کہ جس میں ملونی ہوگی سونٹھ کی۔''

آیت ۱۸ ﴿عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ⑱﴾ ''یہ ایک چشمہ ہے اس (جنّت) میں جس کا نام سلسبیل ہے۔''

آیت ۱۹ ﴿وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ﴾ ''اور ان پر گردش میں رہیں گے ایسے لڑکے (خُدّامِ جنّت) جو ہمیشہ اسی عمر (اور شکل) میں رہیں گے۔''

﴿اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ⑲﴾ ''جب تم انہیں دیکھو گے تو محسوس کرو گے کہ جیسے وہ موتی ہیں بکھرے ہوئے۔''

یعنی وہ نوعمر خادم نہایت خوبصورت ہوں گے۔

آیت ۲۰ ﴿وَاِذَا رَاَیۡتَ ثَمَّ رَاَیۡتَ نَعِیۡمًا وَّمُلۡکًا کَبِیۡرًا ﴿۲۰﴾﴾ ''اور تم جہاں بھی دیکھو گے وہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور بہت بڑی بادشاہی دیکھو گے۔''

آیت ۲۱ ﴿عٰلِیَہُمۡ ثِیَابُ سُنۡدُسٍ خُضۡرٌ وَّاِسۡتَبۡرَقٌ ۫﴾ ''ان کے اوپر لباس ہوں گے باریک سبز ریشم کے اور گاڑھے ریشم کے۔''

﴿وَّحُلُّوۡۤا اَسَاوِرَ مِنۡ فِضَّۃٍ ۚ﴾ ''اور انہیں کنگن پہنائے جائیں گے چاندی کے۔''

﴿وَسَقٰہُمۡ رَبُّہُمۡ شَرَابًا طَہُوۡرًا ﴿۲۱﴾﴾ ''اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ مشروب۔''

آیت ۲۲ ﴿اِنَّ ہٰذَا کَانَ لَکُمۡ جَزَآءً وَّکَانَ سَعۡیُکُمۡ مَّشۡکُوۡرًا ﴿۲۲﴾﴾ ''(اور کہا جائے گا:) یہ تم لوگوں کے لیے بدلہ ہے' اور تمہاری جِدّوجُہد مقبول ہو چکی ہے۔''

تم لوگ اپنی دنیوی زندگی میں غلبۂ دین کے لیے جو جِدّوجُہد کرتے رہے تھے وہ اللہ کے ہاں قبول کر لی گئی ہے اور اس کی قدردانی کے طور پر تم لوگوں کو جنّت اور اس کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!

آیات ۲۳ تا ۳۱

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِیۡلًا ﴿ۚ۲۳﴾ فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَ لَا
تُطِعۡ مِنۡہُمۡ اٰثِمًا اَوۡ کَفُوۡرًا ﴿ۚ۲۴﴾ وَ اذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا ﴿ۖۚ۲۵﴾
وَ مِنَ الَّیۡلِ فَاسۡجُدۡ لَہٗ وَ سَبِّحۡہُ لَیۡلًا طَوِیۡلًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ
یُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ وَ یَذَرُوۡنَ وَرَآءَہُمۡ یَوۡمًا ثَقِیۡلًا ﴿۲۷﴾ نَحۡنُ
خَلَقۡنٰہُمۡ وَ شَدَدۡنَاۤ اَسۡرَہُمۡ ۚ وَ اِذَا شِئۡنَا بَدَّلۡنَاۤ اَمۡثَالَہُمۡ
تَبۡدِیۡلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ ہٰذِہٖ تَذۡکِرَۃٌ ۚ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ
سَبِیۡلًا ﴿۲۹﴾ وَ مَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ
عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿٭ۖ۳۰﴾ یُّدۡخِلُ مَنۡ یَّشَآءُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ وَ الظّٰلِمِیۡنَ
اَعَدَّ لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۳۱﴾

آیت ۲۳ ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ تَنۡزِیۡلًا ﴿۲۳﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ) ہم نے

ہی نازل کیا ہے آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے۔''

آیت ۲۴ ﴿فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ﴾ ''تو آپ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا''

ربط مضمون کے اعتبار سے یوں سمجھیے کہ ان آیات کا تعلق سورۃ القیامہ کی ان آیات سے ہے: ﴿لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ ﴿ؕ۱۶﴾ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ ﴿ۚ۱۷﴾﴾ ''آپؐ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اسے جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے''۔ یعنی ہم نے قرآن مجید کو بطرزِ تنزیل (تھوڑا تھوڑا کر کے) ہی نازل کرنا ہے' ہماری مشیّت اسی میں ہے۔ ہمارا ہر حکم اور ہر فیصلہ اُسی وقت پر نازل ہو گا جو وقت ہم نے اس کے نزول کے لیے طے کر رکھا ہے۔ چنانچہ آپؐ کو نہ صرف نزولِ قرآن کے حوالے سے صبر کرنا ہے بلکہ مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے بھی آپؐ کو اپنے رب کے احکام کا منتظر رہنا ہے۔

﴿وَلَا تُطِعۡ مِنۡہُمۡ اٰثِمًا اَوۡ کَفُوۡرًا ﴿۲۴﴾﴾ ''اور آپؐ ان میں سے کسی گناہگار یا ناشکرے کی باتوں پر دھیان نہ دیجیے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ بُکۡرَۃً وَّاَصِیۡلًا ﴿۲۵﴾﴾ ''اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیجیے صبح و شام۔''

آیت ۲۶ ﴿وَمِنَ الَّیۡلِ فَاسۡجُدۡ لَہٗ﴾ ''اور رات کے ایک حصّے میں اُس کے لیے سجدہ کیا کیجیے''

﴿وَسَبِّحۡہُ لَیۡلًا طَوِیۡلًا ﴿۲۶﴾﴾ ''اور رات کے بڑے حصّے میں اُس کی تسبیح کیا کیجیے۔''

یہ اسی حکم کا تسلسل ہے جو سورۃ المزمل کی ابتدائی آیات میں دیا گیا تھا۔ یعنی آپؐ رات کا بیشتر حصّہ اللہ کے حضور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنے' اُس کے حضور سر بسجود رہنے اور اس کی تسبیح کرنے میں صرف کیا کریں۔ اُس وقت تک چونکہ ابھی نماز پنجگانہ کا حکم نہیں آیا تھا' اس لیے سارا زور رات کی عبادت پر تھا۔ بعد میں جب نماز پنجگانہ کی فرضیت کا حکم آ گیا تو اس ''قیام اللیل'' کو مختصر کر کے تہجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ بھی سب کے لیے نہیں صرف حضور ﷺ کے لیے: ﴿وَمِنَ الَّیۡلِ فَتَہَجَّدۡ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ﴾ (بنی اسراءیل:۷۹)۔ نَافِلَۃ کے لفظی معنی اضافی اور زائد کے ہیں۔ یعنی حضور ﷺ کے لیے نماز تہجد باقی فرض نمازوں کے علاوہ اضافی

فرض کے درجے میں تھی‘ جبکہ اُمت کے لیے اس کی حیثیت نفل کی ہے۔

آیت ۲۷ ﴿اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾﴾ ’’یقیناً یہ لوگ فوری ملنے والی چیز (دنیا) سے محبّت کرتے ہیں اور ایک بھاری دن جو ان کے پیچھے آنے والا ہے‘ اس کا دھیان چھوڑے بیٹھے ہیں۔‘‘

یعنی قیامت کا سخت دن: ﴿يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿۱۷﴾﴾ (المزمل) ’’وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا‘‘ —— زیر مطالعہ آیت کے مضمون کا ربط سورۃ القیامہ کی ان آیات کے ساتھ ہے: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾﴾ ’’ہرگز نہیں! اصل میں تم لوگ عاجلہ (جلد ملنے والی چیز) سے محبت کرتے ہو۔ اور تم آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔‘‘

آیت ۲۸ ﴿نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ﴾ ’’ہم نے ہی ان کو تخلیق فرمایا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے ہیں۔‘‘

﴿وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾﴾ ’’اور ہم جب چاہیں گے ان جیسے بدل کر اور لے آئیں گے۔‘‘

عام طور پر اس آیت کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے ایک قوم کو ختم کر کے اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے۔ لیکن اس سے پہلے چونکہ انسانی تخلیق اور انسانی جسم کے جوڑ بند درست کرنے کا ذکر ہوا ہے اس لیے میرے نزدیک اس جملے کا درست مفہوم یہ ہے کہ آخرت میں ہم ان لوگوں کو ان کے دنیوی زندگی والے جسموں جیسے اور جسم عطا کر دیں گے۔ واضح رہے کہ یہ مضمون قبل ازیں سورۂ بنی اسرائیل: ۹۹‘ سورۂ یٰسٓ: ۸۱ اور سورۃ الواقعہ: ۶۱ میں بھی آ چکا ہے۔

آیت ۲۹ ﴿اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ﴾ ’’یقیناً یہ تو ایک یاد دہانی ہے۔‘‘

﴿فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾﴾ ’’تو جو چاہے اپنے ربّ کی طرف راستہ اختیار کر لے۔‘‘

یعنی جس کا جی چاہے اپنے رب کے قُرب کا راستہ اختیار کر لے۔ اس مضمون کے حوالے سے صوفیاء کے ہاں سیر اِلی اللہ‘ تقرّب اِلی اللہ‘ سلوک اِلی اللہ وغیرہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔

آیت ۳۰ ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ﴾ ’’اور تمہارے چاہے کچھ نہیں ہو سکتا‘ جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔‘‘

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾﴾ ’’یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا‘ کمال حکمت والا ہے۔‘‘

آیت ۳۱ ﴿يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ﴾ ’’وہ داخل کرے گا اپنی رحمت میں جس کو چاہے گا۔‘‘

ظاہر ہے دنیا و آخرت کا کوئی کام بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہم اللہ کے حکم اور اذن کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص ایک کام کرنے پر بظاہر قادر بھی ہو تو وہ اس کام کو اُس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک اس کی مشیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی شامل نہ ہو۔ اہلِ سُنّت کا عقیدہ ہے کہ جس طرح ہم خود اللہ کی مخلوق ہیں اسی طرح ہمارے تمام اعمال بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ سورۃ الصّافّات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾ کہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو بھی۔ اس مفہوم میں ہر انسان اپنی نیت اور اپنے ارادے کی بنا پر ’’کاسبِ اعمال‘‘ ہے‘ جبکہ ’’خالقِ اعمال‘‘ اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا اسے ایسے اعمال کی توفیق دے گا جن کی بنا پر وہ اُس کی رحمت کا مستحق ٹھہرے گا۔

اس جملے کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ داخل کرے گا اپنی رحمت میں‘ اُسے جو چاہے گا۔ یعنی وہ صرف اُسی شخص کو اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے گا جو اُس کی رحمت کا مستحق بننے کے لیے کوشاں ہو گا۔ جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾﴾ یعنی جس شخص نے آخرت کو اپنا اصل مقصود بنا لیا اور اس کے لیے اس نے مقدور بھر محنت بھی کی اور وہ مؤمن بھی ہو‘ تو اُس کی وہ محنت اور کوشش اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول و مشکور ہو گی۔

﴿وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾﴾ ’’اور رہے ظالم‘ تو ان کے لیے اُس نے بہت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔‘‘

اَللّٰھُمَّ اَعِذْنَا مِنْ ذٰلِکَ ! اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنْ ذٰلِکَ!

جنگِ ستمبر: تجزیہ اور تجاویز

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ایک دانش مند قوم کو ایسے موقع پر جو اس وقت ہمیں درپیش ہے‘ حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر دیکھنا چاہیے کہ حریف کے مقابلے میں ہمارے کمزور پہلو کیا ہیں اور قوت و طاقت کے ذرائع کیا ہیں! عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی قوت اور طاقت کے ذرائع کو مضبوط کیا جائے‘ اور کمزور پہلوؤں کی تلافی کی جائے۔

ہندوستان ہم سے کئی گنا زیادہ آبادی رکھتا ہے۔ رقبے کے لحاظ سے بھی کئی گنا بڑا ہے اور ذرائع‘ وسائل‘ اسلحے کی مقدار کے لحاظ سے بھی۔ ان حیثیتوں سے ہم ان اُمور کی تلافی کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ رقبہ بڑھانا چاہیں تو نہیں بڑھا سکتے اور تعداد کے لحاظ سے اس کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اس کے اسلحے کی فراہمی کے ذرائع اور وسائل بھی ہم سے زیادہ ہیں۔ ان پہلوؤں سے یہ ممکن نہیں کہ ہم اس سے بڑھ جائیں یا اس کے برابر ہی پہنچ جائیں۔

اب یہ دیکھیے کہ ہماری طاقت کے ذرائع کیا ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اگر ہم ان ذرائع کو بڑھائیں تو ہم دشمن سے بڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ ذرائع اگر ہمیں مضبوط بناتے ہیں‘ تو پھر یقیناً انہیں بڑھانا ہی عقل مندی کا تقاضا ہوگا۔

ہماری طاقت کے اتھاہ ذخیرے

ہمارے لیے سب سے اولین شعبہ طاقت کا وہ اتھاہ ذخیرہ ہے جس میں ہندوستان بلکہ پوری کافر دنیا ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ ایمان اور اسلام کی دولت ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اس جنگ میں ہمیں کامیابی اس لیے ہوئی کہ ہماری فوج دشمن کی فوج کے مقابلے میں بہتر تربیت یافتہ تھی تو میں اسے غلط نہیں کہتا‘ مگر واقعہ یہ ہے کہ محض فوجی تربیت اور اسلحے کے استعمال کی مہارت ہی سے ہم فتح یاب نہیں ہوئے۔ ہم نے فوجی تربیت انگریزی نظامِ عسکریت کے تحت پائی۔ اُدھر دشمن نے بھی یہی تربیت حاصل کی تھی۔ محض اسی پر انحصار کر کے ہم بازی نہیں جیت سکتے تھے۔ تو کس چیز نے ایک اور دس کے مقابلے میں ہمیں کامیاب کرایا؟ دراصل یہ اللہ پر ایمان‘ آخرت

کا یقین‘ محمد رسول اللہ ﷺ کے دین کی محبت‘ اور یہ یقین تھا کہ اگر ہم شہید ہو گئے تو ہماری بخشش ہو گی اور ہم جنت میں جائیں گے۔ اس چیز نے ہمارے سپاہی کو طاقت ور بنایا۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ ان علاقوں سے جو دشمن کی زد میں تھے‘ ہماری آبادی اس طرح نہیں بھاگی جس طرح دوسری جنگِ عظیم کے دوران فرانس کی آبادی ان علاقوں سے بھاگی جن پر جرمن فوجوں نے حملہ کیا تھا۔ ہمارے تاجر نے اس اخلاق کا ثبوت دیا جو زندہ قوموں کے شایانِ شان ہے۔ اس کی نظیر نہیں ملتی کہ جنگ چھڑ جائے اور ضرورت کی عام چیزیں بازار سے غائب نہ ہوں بلکہ پہلے سے بھی سستی ہو جائیں۔ یہ آخر کس چیز کا فیض ہے بجز ایمان کے اور ان اخلاقیات کے جو ہمیں اسلام کی بدولت حاصل رہے ہیں! درحقیقت اللہ تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے دینِ اسلام کے سوا اور کوئی چیز ہمیں بچانے والی نہیں ہے۔

تجربے سے سبق

ایک عقل مند کا کام یہ ہوتا ہے کہ جب حریف کے مقابلے میں اسے اپنی طاقت و قوت کے ذرائع کا علم ہو جائے تو انہیں بڑھانے کی کوشش کرے‘ نہ کہ انہیں ختم کرنے میں لگ جائے۔ یہ تجربہ جو ہمیں اس جنگ میں ہوا ہے‘ ہم اسے بار بار نہیں دہرا سکتے۔ ہم اپنے نوجوانوں کو وہ تعلیم نہیں دے سکتے جو انہیں ذہنی شکوک و شبہات میں مبتلا کرے۔ ہم قوم کو عیاشی کی شراب نہیں پلا سکتے۔ ہم قوم کی اخلاقیات کا ستیاناس نہیں کر سکتے۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ہماری مسلسل غلطی کے باوجود صرف ایمان اور اخلاق ہی ہمارے کام آئے ہیں۔ اب اگر ہم بار بار اپنی اسی طاقت کو کمزور کرنے والے طریقے اور راستے اختیار کرتے چلے جائیں گے تو نہ معلوم ہم میں سے کتنے آئندہ بھی مضبوط ثابت ہوں؟ ہر نئی آزمائش کے موقع پر پہلے سے کمزور ہوتے چلے جانا ایک فطری چیز ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں ہماری کسی غلطی کی سزا نہیں دی۔ اس لیے اب ہمیں اپنی ایمانی قوت کو مضبوط کرنے اور اخلاقی طاقت کو ناقابلِ تسخیر بنانے والے ذرائع کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم کا جائزہ لینا چاہیے کہ یہ نوجوانوں میں کس حد تک ایمان کے بیج بوتا ہے۔ اس سلسلے میں جہاں کمزوری ہو‘ اسے رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی طرح ہمیں اپنے اخلاق کو سنبھالنے کی فکر کرنی چاہیے۔ نشر و اشاعت کے تمام ذرائع کو اس کی فکر کرنی چاہیے اور وہ کام نہ کیے جائیں جو اخلاق کو کمزور کرنے والے ہوں‘ بلکہ ایک سچے مسلمان کی سیرت کو نشوونما دینے کی نیت اور جذبے سے کام کیا جانا چاہیے۔

ہندو قوم چاہے کتنی ہی کثیر تعداد میں کیوں نہ ہو‘ وہ بھارت تک محدود ہے۔ اس کے برعکس یہ اللہ کا فضل ہے کہ ہم اس دینِ حق سے تعلق رکھتے ہیں جو دنیا کے ہر گوشے میں پھیلا ہوا ہے۔ مسلمان جہاں بھی ہیں وہ فطری طور پر ہمارے دوست اور اتحادی ہیں اور یہ بھی اسلام کی بدولت ہے۔ پھر مسلمان ملکوں میں سے جو اقوام متحدہ کے رکن ہیں‘ یہ سب ہمارے فطری اور پیدائشی حامی ہیں۔ ان ممالک کی حکومتیں اگر کسی موقع پر ہماری حمایت نہ بھی کرتی ہوں‘ تب بھی ان ملکوں کے عوام ہمیشہ ہماری حمایت کرتے ہیں۔ جہادِ پاکستان نے عالمِ اسلام پر جو اثر ڈالا ہے‘ اس مناسبت سے عرب دنیا کے ایک نامور لیڈر کہتے ہیں: ’’اسرائیل کی آبادی صرف ۲۲ لاکھ ہے اور سات آٹھ کروڑ عرب اس سے ڈرتے ہیں جبکہ پاکستان نے صرف دس کروڑ کی آبادی کے ساتھ ۴۸ کروڑ آبادی کے بھارت کے دانت کھٹے کر دیے ہیں۔‘‘ پھر انہوں نے یہ سوال عربوں کے سامنے رکھا ہے کہ: غور کیجیے کہ آخر وہ کون سی بنیادی وجہ ہے کہ جو آپ کو اسرائیل کے مقابلے میں کمزور بنائے ہوئے ہے؟

ان نکات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جہادِ پاکستان نے خود عالمِ اسلام پر کیسا عظیم الشان اثر ڈالا ہے۔ فی الحقیقت یہ جو کچھ ہوا ہے‘ بالکل فطری طور پر ہوا ہے۔ یہ ہماری کوششوں سے نہیں ہوا‘ لیکن اسے اب نشوونما دینا ہمارا فرض ضرور ہے۔

گزشتہ برسوں میں ہم نے مسلمان ملکوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ پاکستان سے پہلے ہم اس بھروسے پر تھے کہ ہندوؤں کے مقابلے میں دنیا کے مسلمان ہمارے ساتھ ہیں اور تقسیم ہند کے بعد بھی ہم اسی بھروسے پر رہے‘ لیکن بھارت نے مسلم ممالک کو ہم سے توڑنے کی زبردست مہم شروع کر دی۔ اس نے مسلمانوں کو ہم سے توڑنے کے لیے اپنے عربی دان مسلمانوں کو پروپیگنڈے کے لیے عرب ملکوں میں بھیجا‘ جنہوں نے وہاں کے دانش وروں اور لیڈروں کو یقین دلایا کہ پاکستان تو انگریزی استعمار کی پیداوار ہے۔ بھارت نے پاکستان کے خلاف اس قدر زہر پھیلایا کہ ۱۹۵۶ء میں جب میں عرب ملکوں میں گیا تو مجھ سے وہاں مقیم پاکستانیوں نے کہا کہ ان ملکوں میں ہمیں خود کو پاکستانی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہاں ہمیں مغربی استعمار کا آلہ کار سمجھا جاتا ہے۔ بھارت نے جو زبردست پروپیگنڈا کیا‘ یہ سب کچھ اس کا نتیجہ تھا۔ لیکن یہ سراسر اللہ کا فضل ہے کہ اس جنگ کے دوران یہ کوشش ناکام ہوگئی۔

اسلام کی بدولت یہ سب کچھ اگر ہمیں اپنی کسی خاص کوشش کے بغیر حاصل ہوا ہے تو عقل مندی یہ ہے کہ اب ہم اپنی خاص کوشش سے اسے بڑھائیں۔

اس ضمن میں ہمارے سفارت خانوں نے جو کردار ادا کیا ہے‘ اس کے متعلق نرم سے نرم الفاظ میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے کوئی خاص خدمت انجام نہیں دی۔ حج کے لیے جانے والے لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس موقع پر ہندوستان صاف ستھری عربی زبان میں اپنے پروپیگنڈے پر مشتمل پمفلٹ تقسیم کرتا ہے کہ ’’بھارت کے مسلمان خیریت سے ہیں اور انہیں ہر طرح کا آرام اور سہولتیں حاصل ہیں۔‘‘ اس کے مقابلے میں حقائق کو سامنے لانے کے لیے ہمیں اول تو کوئی چیز شائع کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہو بھی تو نہایت گھٹیا انداز میں کہ اسے کوئی پڑھتا بھی نہیں۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ عرب ممالک میں ہمارے سفارت خانوں میں عربی جاننے والے لوگ موجود ہوں اور دوسرے ممالک کے سفارت خانوں میں بھی اس ملک کی زبان جاننے والے لوگ ہوں۔ فارن سروس میں لیے جانے والے لوگوں کے لیے یہ چیز لازمی کرنی چاہیے تاکہ وہ اس ملک میں اپنا موقف اور نقطہ نظر کامیابی کے ساتھ پیش کر سکیں۔

خود ہمارے نظامِ تعلیم میں بھی عربی کو ایک لازمی زبان کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔ عربی زبان جسے مُلاّ کی زبان سمجھا جاتا رہا ہے‘ آج دنیا کے ۱۳ ایسے ممالک کی زبان ہے جو خلیج فارس سے اٹلانٹک تک پھیلے ہوئے ہیں اور اقوام متحدہ کے رکن ہیں۔ ان ملکوں میں ڈاکٹروں‘ انجینئروں‘ پروفیسروں اور دیگر ٹیکنیکل عملے کی ضرورت ہے۔ ہم یقیناً ایسا عملہ ان ملکوں کو دے سکتے ہیں‘ لیکن زبان کی اجنبیت مانع ہے۔ وہ لوگ اپنی ضرورت کے تحت ڈاکٹر اور انجینئر وغیرہ منگواتے ہیں‘ مگر جب وہاں ڈاکٹر اور مریض کے درمیان‘ انجینئر اور اس کے ماتحت عملے کے درمیان زبان کی مشکل حائل ہوتی ہے تو پھر انگریزی مترجمین کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں کالجوں میں وظیفے دے کر طلبہ کو عربی پڑھنے پر آمادہ کیا جا سکے‘ تو یہ ماہرین ہمارے قدرتی سفیر ثابت ہوں گے۔ اس طرح کوئی وجہ نہیں کہ وہ ملک ہماری حمایت نہ کریں۔ میں نے یہ چند عملی تجاویز مختصر الفاظ میں بیان کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں بروئے کار لانے کی توفیق دے۔ (۱۶ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو انجمن شہریان لاہور کے جلسے سے خطاب)

❀❀❀

برِّصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد اور احیائی فکر کا ارتقاء(۲)

قیصر جمال فیاضی☆

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے اپنے ہفت روزہ اخبار ’’الہلال‘‘ اور ’’البلاغ‘‘ کے ذریعے ایک طوفان کی طرح مسلمانانِ ہند کی سیاسی واجتماعی زندگی پر چھا گئے۔ انہوں نے مغربی تہذیب پر شدید تنقید کی۔ مسلمانوں میں جہاد‘ جدوجہد اور قربانی کے جذبے کو بیدار کیا۔ سرسید احمد خان‘ مولوی چراغ علی اور سید امیر علی کے ہاتھوں جو نیا علم الکلام پروان چڑھ رہا تھا‘ اس کی اصلاح کی۔ اگرچہ تعبیر کے معاملات میں بعض جگہ مولانا آزاد سے چوک ہوئی‘ خاص طور پر واحد ہندی قومیت اور وحدتِ ادیان کے مسئلہ پر انہوں نے زبردست ٹھوکر کھائی‘ لیکن بحیثیت مجموعی انہوں نے انہی خطوط پر بیان وکلام کی روایت کو قائم کیا جس کی بنیاد شاہ ولی اللہؒ نے رکھی تھی۔ تاہم یہ ہماری تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے کہ اتنا بڑا آدمی ایک بڑا کام سرانجام دے کر بالکل ہی اُلٹے رخ پر چل پڑا۔ وہ ابوالکلام جو ایک زمانے میں جہاد کے لیے پکارتا تھا‘ ۱۹۲۴ء کے بعد ہندوؤں سے سمجھوتے کی دعوت دینے لگا اور پھر باقی تمام زندگی انڈین نیشنل کانگریس کا حاشیہ بردار بن کر گزار دی۔

مولانا محمد علی جوہرؔ بڑے مخلص اور سچے مسلمان تھے۔ وہ کوئی بہت بڑے مفکر تو نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات پر انہیں انتہائی حد تک یقین تھا۔ کامل یقین اور توکل کی مثال اس زمانے میں اس سے اعلیٰ نہیں مل سکتی کہ ایک شخص جیل میں پڑا ہے‘ اس کی سب سے بڑی بیٹی آمنہ بیمار ہے‘ زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ لیکن ایسے حالات میں بھی باپ کی زبان سے یہی نکلتا ہے کہ: ؎

☆ معاون شعبہ تعلیم وتربیت‘ تنظیم اسلامی

تیری صحت ہمیں منظور ہے لیکن اُس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں!

اس طرح یہ بات بھی محمد علی جوہرؔ جیسا بندۂ مؤمن ہی کہہ سکتا ہے: ؎

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے!

مولانا محمد علی جوہر کا اصل جوہر ’’تحریک خلافت‘‘ میں کھلا‘ جس کے ذریعے ہندوستان کے طول وعرض میں بیداری کی ایک نئی تحریک رونما ہوئی اور مسلمانوں پر مسلط مایوسی ختم ہوئی۔ اس تحریک خلافت نے اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا کہ ہندو مسلم اتحاد نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کا مستقبل ہندوؤں کے ساتھ نہیں‘ ان سے الگ ہے۔

اس دور کے تیسرے معمار علامہ اقبال ہیں۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم شاعر‘ بالغ نظر مفکر اور بلند پایہ فلسفی تھے۔ مسلمانوں کی سیاسی بیداری ابھی تک ایسی فکری قوت سے محروم تھی جو اسے تہذیبی انقلاب کا پیش خیمہ بنا دیتی۔ علامہ اقبال نے اس خلاء کو پُر کیا اور عصرِ حاضر میں احیائے اسلام کی بنیادیں رکھیں۔ انہوں نے مغربی تہذیب کا بڑے قریب سے مشاہدہ اور گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا: ؎

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

دوسرے مقام پر علامہ کہتے ہیں: ؎

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

علامہ محمد اقبالؒ مسلمانوں کی ذہنی غلامی کو ختم کرنے کے لیے ملّت سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں: ؎

شفق نہیں مغربی افق پر‘ یہ جوئے خوں ہے‘ یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا‘ وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمارخانہ
ہوا ہے گو تندوتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

علامہ اقبال ۱۹۰۵ء میں ۲۸ سال کی عمر میں انگلستان چلے گئے اور تین سال تک انگلستان اور جرمنی میں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں رہ کر وہاں کی تہذیب کا مطالعہ کرنے اور فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد ان کی قلب ماہیت ہوگئی۔ علامہ اقبال خود کہتے ہیں: ع مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے۔ چنانچہ وہاں سے واپس آنے کے بعد ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۳ء تک علامہ اقبال نے اسلام کے نظامِ فکر‘ فلسفہ اور حکمت کو اپنی شاعری کے ذریعہ بیان کیا۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میرے پیغام میں سوائے قرآن کے کچھ اور نہیں ہے۔ اقبال سرورِ کائنات ﷺ کے حضور مناجات کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را زِ خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

’’اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر میرا دل اس آئینہ کی مانند ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو اور اگر میری شاعری میں قرآن کے سوا کسی اور چیز کی ترجمانی ہے تو آپ میری فکر کا

پردہ چاک کر دیجیے اور اس چمن کو مجھ جیسے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔ مزید برآں قیامت کے دن مجھے ذلیل وخوار کر دیجیے گا اور مجھے اپنی قدم بوسی سے محروم کر دیجیے گا۔‘‘

علامہ اقبال نے مغربی فکر پر شدید تنقید کی اور خاص طور پر مغربی تہذیب کی نفی کی۔ اس سے بڑھ کر وہ تجدیدِ ملّتِ اسلامی اور احیائے فکرِ اسلامی کے علمبردار بن کر سامنے آئے۔ اقبال نے خوش خبری دی کہ اگرچہ اس وقت ملّتِ اسلامیہ پسی اور دبی ہوئی ہے‘ لیکن اس کا دوبارہ غلبہ ہوگا۔ ملّتِ اسلامیہ کی تجدید ہوگی‘ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ہوگی۔ اس طرح اقبال اسلام کے روشن مستقبل کے مبشّر بن کر سامنے آئے۔

اقبال نے ایک اور بہت بڑا کام یہ کیا کہ انہوں نے وطنی قومیت کی شدید ترین نفی کی۔ اس دور میں وطنی قومیت مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے پوری قوت کے ساتھ زور لگا رہی تھی۔ اپنی نظم ’’وطنیت‘‘ میں وہ کہتے ہیں: ؎

اس دور میں مے اور ہے‘ جام اور ہے‘ جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ خاک میں اِس بت کو ملا دے!

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۹۳۰ء اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس برس محمد علی جناح مقامی سیاست سے مایوس ہو کر انگلستان میں آباد ہوگئے تھے۔ علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو وہاں محمد علی جناح سے ملاقاتیں کرنے کا موقع ملا۔ علامہ اقبال نے

محمد علی جناح کو یہ باور کرایا کہ آپ اسلام کے احیاء کی بات کریں‘ یہ چیز مسلمانوں کے جذبات میں گرمی اور حرارت پیدا کر دے گی۔ لہٰذا محمد علی جناح کے مزاج میں تبدیلی آئی‘ ۱۹۳۴ء میں ہندوستان واپس آ کر انہوں نے مسلم لیگ کی صدارت سنبھال لی‘ اور پھر اگلے دس برس تک مسلسل تکرار کے ساتھ صرف یہی بات کی کہ ہمیں اسلام چاہیے۔ ہم اسلامی تہذیب اور اسلامی قوانین چاہتے ہیں۔ اسلام صرف ہمارا مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کے اندر ایک ولولۂ تازہ پیدا کر دیا۔ بقول اقبال ؎

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

اس اعتبار سے علامہ اقبال کا ۱۹۳۰ء کا خطبہ الٰہ آباد بھی بہت اہم ہے۔ اس خطبہ میں علامہ اقبال کے الفاظ تھے:

’’میں پنجاب‘ سرحد‘ سندھ اور بلوچستان کو متحد ہو کر ایک واحد ریاست کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں‘ جس کی اپنی حکومت ہو خواہ سلطنتِ برطانیہ کے تحت یا اس سے الگ۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ یہ متحدہ شمال مغربی مسلم ریاست کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تقدیر مبرم ہے۔‘‘

اقبال نے جہاں مغرب کی کمزوریوں اور خامیوں پر بھرپور تنقید کی وہاں اس کی خوبیوں‘ خاص طور پر سائنس میں ترقی اور جذبۂ عمل و حرکت کو بھی سراہا ہے۔ ان کے بقول یہ صفات یورپ نے خود مسلمانوں ہی سے سیکھی تھیں‘ لیکن افسوس کہ آج مسلمان خود ان صفات سے محروم ہیں جو ان کی اپنی کھوئی ہوئی متاع ہے۔

اقبال کی فراست کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک دورِ حاضر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کی ضرورت ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے غلبہ کو روکنے کے لیے کچھ نئے وسائل و آلات اور نئے ذرائع درکار ہوں گے۔ انہیں اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ اسلام فطرتاً ایک انقلابی تحریک ہے لیکن صدیوں کے جمود نے اس جوہر پر ایک زنگ کی تہہ جمادی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ زنگ کھرچ دیا جائے۔ اسلام کی حقیقی تصویر دوبارہ سامنے آئے اور یہ شمع سارے عالم کو ایک مرتبہ پھر منور کر دے۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (Reconstruction of Religious Thought in Islam)

کے نام سے ان کی تقاریر‘ اسی مقصد کے حصول کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

علامہ اقبال کی فکر کا ایک منفرد پہلو یہ ہے کہ انہوں نے روحانی اور مادی دونوں طاقتوں کے امتزاج کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر مسلمان دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں روحانی و اخلاقی اور مادی و دنیوی دونوں شعبوں میں ترقی کرنی ہوگی۔ سرسید احمد خان کے یہاں دنیاوی و مادی پہلو کا غلبہ ہے جبکہ دوسری طرف علماء کے یہاں صرف روحانی اور اخلاقی پہلو نمایاں ہے۔

اقبال کو صرف ایک شاعر یا فلسفی کہنا بہت بڑا ظلم ہے‘ بلکہ وہ ایک ایسے انقلابی اور مصلح تھے جنہوں نے جدید اسلامی احیاء کو نظریاتی اساس دی۔ پورے ملک کو شاعری کے ذریعے خوابِ غفلت سے جگایا اور ملّت کو اس کے اصل مشن پر گامزن کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ’’مثنوی اسرارِ خودی‘‘ اور ’’رموزِ بے خودی‘‘ کا پیغام یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اصل راہِ نجات اپنے پروردگار کے احکام اور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں ہے۔ توحید کے ذریعہ معاشرے میں یک رنگیٔ خیال اور عملی یکسانیت پیدا ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ انقلابی قوت کسی اور چیز میں نہیں۔

اقبال نے شاعری بطور لٹریچر نہیں کی بلکہ اسے انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے استعمال کیا تاکہ لوگوں کے اندر ایک انقلابی جذبہ بیدار ہو۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

’’شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔‘‘

اقبال نے مسلمانوں میں جذبۂ عمل بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی یقین دلایا کہ مستقبل میں دنیا کی امامت تمہارے ہاتھ میں ہوگی ؎

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے!
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

اقبال دینی امور میں حد درجہ احتیاط کے قائل تھے۔ انہوں نے تقریباً تمام اہم امور میں علماء متقدمین اور سلف کی اتباع کی ہے۔ دین میں کسی بھی قسم کی کانٹ چھانٹ کی حوصلہ افزائی

نہیں کی۔ رائے قائم کرنے میں غلطی ہر انسان سے ہو سکتی ہے مگر اقبال کا نقطۂ نظر خالص اسلامی تھا۔ وہ اسلام کو زمانے کی خراد پر تراشنے کو کفر اور گمراہی سمجھتے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ عہدِ حاضر کے پیدا کردہ مسائل کا حل اسلام کی تعلیمات سے تلاش کیا جائے اور زمانے کو اسلام کے مطابق بدل ڈالا جائے۔ علماء کو ان سے اور انہیں علماء سے شکایت رہی مگر اس کے باوجود وہ ہر قدم پر علماء سے رجوع کرتے نظر آتے ہیں اور ان کا پورا پورا ادب و لحاظ کرتے ہیں۔

اسی دور میں ایک اور بڑی دینی اصلاحی تحریک ابھر کر سامنے آئی ۔ ہماری مراد تبلیغی جماعت سے ہے۔ مولانا محمد الیاسؒ نے اس کام کی بنیاد رکھی۔ ان کے والد مولانا اسماعیل بستی نظام الدین میں ایک چھوٹی سی مسجد اور مدرسے کے امام تھے جہاں میواتی بچے پڑھا کرتے تھے۔ باپ اور بڑے بھائی کے انتقال کے بعد مولانا محمد الیاس اس مدرسہ کے جانشین بنے۔ آپ نے محسوس کیا کہ بچوں کے بجائے بڑوں کو دین کی موٹی موٹی باتیں سکھانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ نے میوات کے لوگوں کو تبلیغی جماعتوں کے ذریعہ کلمہ اور نماز سکھانی شروع کی۔ ان پر عبادات اور اذکار کے فضائل واضح کیے۔ مولانا محمد الیاس نے ۱۹۲۵ء میں تبلیغ کا کام شروع کیا لیکن قضائے الٰہی نے انہیں زیادہ مہلت نہ دی اور ۱۹۴۴ء میں صرف ۵۸ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مولانا بہت متحرک شخصیت کے حامل تھے۔ آج بھی تبلیغی جماعت سب سے زیادہ متحرک دینی اصلاحی تحریک ہے۔

اس تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شدھی اور سنگھٹن جیسی ہندو تحریکوں کا سدِ باب کیا۔ ہندوستان کے دیہات میں اکثریت ایسے مسلمانوں کی تھی جن کا صرف نام مسلمانوں جیسا تھا' باقی سب کام ہندوؤں جیسے تھے۔ نماز پڑھنا تو دور کی بات' انہیں کلمہ بھی پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہندوؤں نے شدھی کی تحریک شروع کی۔ وہ اس طرح کے نام نہاد مسلمانوں کو لالچ وغیرہ دے کر انہیں ان کے آبائی مذہب یعنی ہندومت کی دعوت دیتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دیہاتی تیزی سے ہندو مذہب اختیار کرنے لگے۔ علماء اور صوفیاء میں اب اتنی قوت نہیں رہی تھی کہ اس تحریک کا مقابلہ کر سکیں' کیونکہ علماء نے اپنے آپ کو مدرسوں تک اور صوفیاء نے خود کو خانقاہوں تک محدود کر لیا تھا۔ جوں جوں تبلیغی جماعت کا کام ہندوستان کے دیہات میں پھیلتا چلا گیا' شدھی کا کام سمٹتا چلا گیا۔ اس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے شدھی کے

اٹھتے ہوئے طوفان اور بڑھتے ہوئے سیلاب کا رخ موڑنے کا کام تبلیغی جماعت سے لیا۔ ع عشق خود اِک سیل ہے' سیل کو لیتا ہے تھام!

البتہ تبلیغی جماعت کی دعوت میں ایک کمی تو یہ رہی کہ اگرچہ اس نے مذہب کی اصلاح کی کوشش کی' لیکن دین کی دعوت نہیں دی اور نہ ہی غلبۂ دین کی جدوجُہد کی دعوت دی۔ دوسری کمی یہ رہی کہ مذہب کی دعوت بھی بزرگوں کی روایات اور ضعیف احادیث سے دی۔ قرآن کو مرکز و محورِ دعوت نہیں بنایا۔

جب ہم بیسویں صدی کے آغاز سے ۱۹۴۰ء تک کے دور کا جائزہ لیتے ہیں تو درج ذیل معاملات میں ہمیں مثبت پیش رفت نظر آتی ہے۔

انفرادی زندگی میں اسلام کے تقاضاؤں کا شعور بیدار رہا۔ اجتماعی اور ملکی زندگی میں مذہبی تحریکوں کو فروغ حاصل ہوا۔ علماء کی قیادت میں قومی زندگی کی تنظیم بہتر ہوئی' دینی لٹریچر تیار ہوا اور مذہبی جذبات کو عام فروغ حاصل ہوا۔

مغربی تہذیب کی یلغار پر ردِّعمل کا آغاز ہوا۔ وہ مرعوبیت' جو اَب تک ذہنیت پر مسلط تھی' کچھ کم ہوئی۔ مغرب کے خلاف سیاسی اور تہذیبی ردِّعمل رونما ہوا اور اندھی تقلید کی رَو کو ایک دھچکا لگا۔

ساتھ ہی ساتھ قومی نقطۂ نظر بیدار ہونا شروع ہوا۔ اپنی تاریخ' اپنے قائدین و مفکرین اور اپنے شعراء کی عظمت کا احساس پیدا ہوا۔

تاہم احیائے اسلام کے نقطۂ نظر سے اس دور میں بعض اہم کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔

تمام قوت اس بات پر صرف ہو رہی تھی کہ اسلام کو اعلیٰ اور شاندار ثابت کیا جا سکے۔ وقت کے مسائل اور حقیقی تہذیبی مشکلات کا ازالہ اور ان کے حل کی طرف توجہ نہیں دی گئی بلکہ ''پدرم سلطان بود'' کی تکرار جاری رکھی گئی۔

بڑی حد تک سارا انداز رومانوی اور جذباتی تھا۔ اس دور کے ادب' صحافت' فلسفہ اور تفسیری ادب میں ایک قسم کا افسانوی اور جذباتی انداز نظر آتا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید بیداری کی اس تحریک کے دور میں زیادہ تر اکابرین شاعر بھی تھے۔

قومی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں ذہنی انتشار اور تضاد نظر آتا ہے۔ ایک جانب ایک ہی

قلم سے حضرت عمر بن الخطاب ؓ اور ہارون الرشید کی عظمت کے نقوش تحریر کیے جا رہے تھے تو دوسری جانب گمراہ کن عقائد کے علم بردار مغل بادشاہ اکبر اور الٰہیاتِ اسلام کے عظیم پیش کار شاہ ولی اللہؒ دونوں کو ایک ہی سانس میں خراجِ عقیدت پیش کیا جا رہا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد اور آگرہ کے تاج محل کو ساتھ ساتھ رکھا جاتا تھا۔

اسلام کی دعوت کو فکری اور فلسفیانہ بنیادوں پر استوار نہ کیا جا سکا۔ دلیل کی جگہ شعر اور حقائق کی جگہ نعروں سے کام چلایا جاتا رہا۔ مغربی تہذیب اور فکر پر کوئی ٹھوس تصنیف سامنے نہیں آئی۔ اہم مسائل پر کوئی تفصیلی بحث نہیں ملتی۔ سائنس پر فلسفہ نے جو حقیقی سوالات پیدا کیے تھے‘ ان سے کوئی پنجہ آزمائی کرتا نظر نہیں آتا۔ علامہ محمد اقبالؒ نے اس سلسلے میں اپنی سی کوشش کی اور ایک نئے انداز کی داغ بیل ڈالی۔ تاہم ان کے کام کا بھی دائرہ محدود تھا اور دائرۂ اثر اس سے بھی زیادہ محدود۔

اس زمانے میں ہمہ گیر حرکت تو بہت نظر آتی ہے‘ مگر مستقل بنیادوں پر مسلمانوں کو اسلامی اصولِ تنظیم کے مطابق جمع نہ کیا جا سکا جس کے ذریعہ ان کی صلاحیتیں مثبت طور پر ایک مرکز کے تحت جمع ہو جاتیں اور ان کی ترقی اور تربیت کا مناسب انتظام ممکن ہوتا۔ اس دور میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کی باہمی کشمکش اور ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش بھی نظر آتی ہے‘ جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ بے اعتمادی کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

’’تحریکِ خلافت‘‘ کی ناکامی کے بعد مسلمان ایک بار پھر مایوسی کے شدید شکار ہو گئے تھے۔ تقریباً تمام مسلمان لیڈر ناکام ہو چکے تھے۔ کوئی کسی دوسرے پر اعتماد کرنے کو تیار نہ تھا۔ دوسری طرف ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی انقلاب کامیاب ہوا تو بہت سے نئے فتنوں نے سر اٹھایا۔ انکارِ حدیث وسنّت‘ تجدد اور تشکیک کے ساتھ ساتھ نام نہاد ’’ترقی پسند ادب‘‘ کی تحریک خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو‘ جو زبانی وکلامی سطح پر اُبھرتی ہوئی اشتراکی تحریک کا علمبردار سمجھا جاتا تھا‘ برطانوی ہند کے نوجوانوں کا ہیرو تھا۔

اس زمانے میں جبکہ تاریکی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی‘ مشیتِ الٰہی کے تحت احیائے اسلام کی نئی کوششیں رونما ہوئیں۔ ایک جانب قائداعظم محمد علی جناح نے تحریکِ پاکستان کی باگ ڈور سنبھالی تو دوسری جانب تحریکِ اسلامی ایک نئے دور کی نقیب ثابت ہوئی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

کے بعد جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمانوں نے ایک ایسے سفر کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں جغرافیائی‘ سیاسی اور سب سے اہم فکری ونظریاتی سطح پر ایک نئی مملکت کی تشکیل ہوئی۔ اقبال اور جناح نے عالمِ اسلام میں جس عملی تصور کی صورت گری کی‘ اس کا متحرک عنوان ’’اسلامی احیاء‘‘ ہے۔

قیامِ پاکستان نے اسلام کی بنیاد پر دورِ حاضر میں ایک ریاست کے قیام کی صورت میں اسلام کے اجتماعی زندگی کے عملی پروگرام کا دروازہ کھول دیا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہی ۱۹۳۲ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کے مشن کو اختیار کرنے کے عزمِ مصمم کے ساتھ ماہنامہ ’’ترجمان القرآن‘‘ کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعہ حکومت الٰہیہ کے قیام کا ایک نصب العین اور تجدید واحیائے دین کا ایک نقشہ مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ مولانا مودودیؒ نے ۳۹۔۱۹۳۸ء میں جو مضامین ’’ترجمان القرآن‘‘ میں لکھے تھے‘ ان کی بنیاد پر ’’جماعت اسلامی‘‘ کی باقاعدہ تشکیل ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔

مولانا مودودیؒ بیک وقت داعیٔ دین بھی تھے اور متکلم بھی۔ مولانا اس دور کے متکلم ہیں جب روس میں اشتراکی نظام نیا نیا آیا تھا اور ہندوستان کے نوجوانوں میں اس نظام کا شہرہ تھا۔ ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ اس پس منظر میں مولانا نے اسلام کا مطالعہ کیا تو وہ انہیں ایک بہترین نظامِ حیات نظر آیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل یہی ہے کہ اس نظام کو زندگی کے تمام گوشوں پر عملاً نافذ کیا جائے۔ علاوہ ازیں مولانا مودودیؒ نے مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بھی استفادہ کیا جو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی تحریک لے کر کھڑے ہوئے تھے‘ مگر ۱۹۲۰ء میں بددل ہو کر اسے چھوڑ دیا اور باقی تمام زندگی کانگریس کے ساتھ گزار دی۔

مولانا مودودیؒ کے نزدیک قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا کتاب اللہ ہونا ہے یعنی یہ رہنمائی کسی انسان کی طرف سے نہیں بلکہ خالق ومالک کی طرف سے ہے اور اس رہنمائی کا ذریعہ اور وسیلہ نبی اکرم ﷺ ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا واحد طریقہ قرآن کی ہدایت کو تسلیم کرنا‘ اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو تبدیل کرنے کا عزم کرنا اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے مطابق اپنی ذات اور پوری دنیا کو ڈھالنا ہے۔ ان کے مطابق اس چیز کے تین پہلو ہیں:

پہلا اور سب سے اہم ’’خدا شناسی‘‘ ہے۔ قرآن کا اصل مخاطب انسان ہے اور اصل مقصود

تمام انسانوں کی دست گیری ہے۔ ''خدا شناسی'' اسلام کی بنیاد اور اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لیے اصل سہارا اور قوت ہے۔

دوسرا ''خود شناسی'' ہے' یعنی یہ سمجھنا کہ اللہ ہمیں کیسے انسان کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے! ہمیں کیا کام سونپا گیا ہے اور کس معیار پر ہمیں کامیابی ملے گی؟ اس کے لیے فرد کا تزکیہ کرنا' اس کی کردار سازی کرنا اور علم وعمل کے اعتبار سے اسے اس لائق بنانا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرے۔

تیسرا پہلو ''خلق شناسی'' ہے۔ اس سے مراد ہے: انسانوں' معاشروں' اقوام اور کائنات میں ہر تخلیق سے قرآن وسُنّت کی ہدایت کے مطابق ربط وتعلق قائم کر کے معاملہ کرنا تاکہ دنیا عدل' امن اور احترامِ آدمیت کا گہوارہ بن جائے۔

ان تینوں پہلوؤں کے لیے جامع اصطلاح ''اقامتِ دین'' ہے۔ مولانا مودودیؒ اپنی شہرۂ آفاق تفسیر ''تفہیم القرآن'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''فہمِ قرآن کی ساری تدبیروں کے باوجود' آدمی قرآن کی رُوح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دُنیا کے عام تصورِ مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لیے جائیں۔ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔

اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر' خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اُٹھوائی اور وقت کے علَم بردارانِ کفر وفسق وضلالت سے اس کو لڑا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید رُوح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیٔ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جُو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اُٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔

ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے ۲۳ سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی' اور حق وباطل کی اس طویل وجاں گسل کش مکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی

نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر ودین اور معرکۂ اسلام وجاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کش مکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں؟

اسے تو پوری طرح آپ اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اُٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے' اُس طرح قدم اُٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکّے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر واُحد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا' منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے' اور سابقین اوّلین سے لے کر مؤلفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔

یہ ایک اور ہی قسم کا سلوک ہے' جس کو میں سلوکِ قرآنی کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے' قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اُتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لُغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں' لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی رُوح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔

پھر اسی کلیہ کے مطابق قرآن کے احکام' اس کی اخلاقی تعلیمات' اس کی معاشی اور تمدّنی ہدایات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اُصول وقوانین آدمی کی سمجھ میں اُس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو' اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے اجتماعی ادارے اس کی بنائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں۔''

(تفہیم القرآن' جلد اوّل' ص ۳۳-۳۵)

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک جماعت اسلامی کے افکار ونظریات درج ذیل تھے:

اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے اور اس کی اصل حیثیت ایک کامل نظریۂ حیات اور مکمل

نظامِ زندگی کی ہے جو اپنی عین فطرت کے تقاضے کے طور پر اپنا کلّی نفاذ اور کامل غلبہ چاہتا ہے۔

عبادت صرف مراسمِ عبودیت کا نام نہیں‘ بلکہ اس نظام کی کلّی اطاعت کا نام ہے۔

مسلمان قوم نہیں‘ اُمّتِ مُسلمہ اور حزبُ اللہ ہیں اور ان کی اصل حیثیت ایک نظریاتی جماعت کی ہے جس کا اوّلین مقصد اپنے نظریات کے مطابق انقلاب برپا کرنا اور اپنے نظامِ زندگی کو بالفعل قائم کرنا ہے۔

دنیا کے موجودہ غیر مسلموں کی ایک عظیم اکثریت قانوناً تو کافر ہے‘ لیکن حقیقتاً کافر نہیں۔ اس لیے کہ ان کے سامنے اسلام کی دعوت ہی پیش نہیں کی گئی کہ ان کے انکار یا رد کر دینے کا سوال پیدا ہو۔ اسی طرح دنیا کے موجودہ مسلمانوں کی اکثریت بھی صرف قانونی اور نسلی مسلمانوں پر مشتمل ہے‘ نہ کہ حقیقی مسلمانوں پر۔ اس لیے کہ نہ ان کے قلوب واذہان میں اسلام کی نظریاتی اور اعتقادی اساسات راسخ ہیں اور نہ ہی ان کے عمل میں اسلامی قوانین کی پابندی اور شریعت پر عمل پایا جاتا ہے۔

کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اوّلاً بلا لحاظ مذہب وملت پوری نوعِ انسانی کو بندگیِ ربّ کی طرف پکارا جائے اور اسلام کی نظریاتی اساسات کو شعوری طور پر قبول کرنے کی دعوت دی جائے۔ پھر سابق غیر مسلموں یا نسلی مسلمانوں میں سے جنہیں بھی اللہ تعالیٰ شعوری طور پر اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے‘ ان کی قوتوں کو ایک ہیئتِ تنظیمی کے تحت اکٹھا کر کے غلبۂ دینِ حق کے قیام کی جدّوجُہد کی جائے۔

انہوں نے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت دی اور اس کے درج ذیل مراحل بیان کیے:

(ا) خود مسلمان بن کر لوگوں کے سامنے دین کا عملی نمونہ پیش کرو اور انہیں بھی دین کی دعوت دو۔

(ب) یہاں تک کہ عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب برپا ہو جائے اور اجتماعی زندگی میں دینِ اسلام کی پیاس بیدار ہو جائے۔ اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی بھی دوسرے نظام کا چلنا دشوار ہو جائے۔

(ج) اسلام کے اصولوں کے مطابق ایک ہمہ گیر تحریک اٹھے جو پورے معاشرے میں اسلامی نظریات کے مطابق ذہنی وفکری اور عملی واخلاقی انقلاب برپا کر دے۔

اس دور کی جماعت اسلامی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے نصب العین اور اس کے طریقۂ کار

کے سوا اسے دنیا کے کسی دوسرے مسئلے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اس دور کی جماعت نے یہ معیار قائم کیا تھا کہ جو حق ہے‘ اسے بلاخوفِ لومۃ لائم بیان کر دیا جائے‘ خواہ عوام الناس اسے قبول کریں یا نہ کریں۔ مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان کے عروج کے دور میں مسلمان دو قومی نظریہ کے تحت متحرک تھے مگر جماعت اسلامی نے مسلم قوم پرستی پر بے دھڑک تنقید کی۔ اس دور میں جماعت اسلامی نے عوامی چندوں سے اپنے آپ کو بالکل پاک رکھا۔ جماعت میں شامل ہونے والے افراد میں نو مسلمانہ جوشِ کار ہوا کرتا اور ان میں بے پناہ جذبۂ عمل بھی تھا۔ وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے اور بڑے سے بڑے نقصان کو گوارا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد جماعت کے قائدین کی اکثریت پاکستان آ گئی۔ جماعت نے دستورِ اسلامی کا مطالبہ منوانے کے لیے تحریک چلائی۔ دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگی رکن مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی جماعت کی حمایت کی۔ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی نے قراردادِ مقاصد منظور کر لی جو دستور کا حصہ تو نہ بن پائی البتہ اس کی حیثیت ایک رہنما اصول کی رہی۔

پاکستان بننے کے بعد جماعت اسلامی ایک قومی جماعت بن گئی۔ اب مسلمان قوم کا لفظ بکثرت استعمال کیا جانے لگا۔ غیر مسلموں کو دعوت دینے کا کام ختم ہو گیا۔ اسلامی انقلاب کے لیے جماعت نے الیکشن کا راستہ اختیار کر لیا‘ تاہم کسی بھی الیکشن میں چھ سات سے زیادہ نشستیں حاصل نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ الیکشن ۲۰۱۸ء میں جماعت نے قومی اسمبلی کی صرف ایک نشست حاصل کی۔ جماعت اب صرف عوامی خدمت کا کام کرتے نظر آتی ہے یا پھر صرف چند اخباری بیانات تک محدود ہے۔ بظاہر جماعت کی ناکامی کی وجوہات درج ذیل نظر آتی ہیں:

جماعت اسلامی انتخابی سیاست کے ذریعے نظام کی تبدیلی چاہتی ہے جبکہ اس کے ذریعہ صرف چہرے تبدیل ہوتے ہیں‘ نظام کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔

انتخابی سیاست دراصل سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا کھیل ہے۔ اس میں علاقائی‘ گروہی اور طبقاتی مفاد کی دُہائی دی جاتی ہے۔ دھونس‘ دھاندلی‘ رشوت اور جوڑ توڑ کا بھرپور استعمال ہوتا ہے۔ ضمیروں کے سودے ہوتے ہیں۔ جماعت اسلامی جیسی اصولی سیاسی جماعت یہ ہتھکنڈے استعمال نہیں کرتی‘ لہٰذا ناکام رہتی ہے۔

علاوہ ازیں‘ جماعت نے اقامتِ دین پر اس قدر زیادہ زور دیا کہ فرد پر اجتماعیت‘ باطن پر ظاہریت‘ اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی اس طرح چھا گئے کہ عملی جدّوجُہد کا اصل مرکز دنیا میں اقامتِ دین بن کر رہ گیا جبکہ آخرت میں کامیابی کے حصول کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے تعلق بنانے کی جدّوجُہد پس منظر میں چلی گئی۔ پھر اقامتِ دین بھی بذریعہ انتخابی سیاست ہونے کی وجہ سے وہی مرکزِ نگاہ بن کر رہ گئی۔

پاکستان بننے سے پہلے جماعت اسلامی کا موقف یہ تھا کہ اوّلاً بلالحاظِ مذہب وملّت پوری نوعِ انسانی کو بندگیٔ ربّ کی دعوت دی جائے اور اسلام کی نظریاتی بنیادوں کو شعوری طور پر قبول کرنے کی طرف پکارا جائے۔ پھر غیر مسلموں میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اسلام کو شعوری طور پر قبول کرنے کی توفیق عطا فرما دے اور نسلی مسلمانوں میں سے بھی جنہیں اپنی دینی ذمہ داریوں کا شعوری احساس ہو جائے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا عزمِ مصمم کریں‘ ان کی قوتوں کو ایک جماعت کے تحت منظم کر کے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی منظم جدّوجُہد کی جائے۔ مگر جماعت اسلامی اس بلند و بالا موقف پر زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ جونہی پاکستان کے نام سے ایک الگ آزاد مسلمان ریاست قائم ہوئی تو اس نے مندرجہ بالا اپنا اصولی موقف ترک کر دیا۔ اب جماعت نے یہ موقف اختیار کیا کہ قراردادِ مقاصد اسمبلی سے منظور ہو جانے کے بعد گویا مملکتِ اسلامیہ پاکستان نے کلمہ پڑھ لیا ہے۔ اب چونکہ یہ ایک اسلامی ریاست ہے‘ لہٰذا اقتدار حاصل کر کے یہاں اسلامی نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ یوں اقتدار کا حصول اب ترجیح اوّل بن گیا اور نظامِ حکومت کی اصلاح کے لیے انتخابی سیاست کا راستہ اختیار کر لیا گیا۔ موقف کی اس تبدیلی پر جماعت کے ارکان میں اختلاف پیدا ہوا۔ اس کے نتیجہ میں ۵۷-۱۹۵۶ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں ارکانِ جماعت کا اجلاس ہوا‘ جس میں اختلافِ رائے شدّت اختیار کر گیا‘ اکابرین کی اکثریت نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔

علیحدہ ہونے والے ارکان میں سے ایک شخصیت ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی بھی تھی۔ ایسے اکثر اراکین نے انفرادی سطح پر اپنی دوسری مصروفیات ڈھونڈ لیں‘ مگر ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسی فکر میں لگے رہے کہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے کسی نہ کسی طرح کوئی اور ہیئت تنظیمی قائم کی جائے۔

(جاری ہے)

احیائی تحریکات کی عمر اور تنظیم اسلامی

عبدالرؤف

برعظیم پاک و ہند میں کم و بیش چار سو سال قبل احیائی مساعی کا آغاز مجدد الف ثانیؒ کے ذریعہ ہوا۔ گزشتہ صدی کے دوران میں اسی جِدّوجُہد کو علامہ اقبال کی انقلابی شاعری‘ ابوالکلام آزاد کی گھن گرج والی تقاریر اور مولانا مودودی کی شستہ تحریروں نے آگے بڑھایا۔ سوچنے سمجھنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس انقلابی فکر سے متاثر ہو کر اس کے لیے اپنی ذہانت‘ فطانت‘ قوت اور صلاحیت لگانے پر آمادہ ہو گئی جس کے نتیجہ میں اس احیائی اور انقلابی فکر کی جڑیں مضبوط ہونا شروع ہوئیں۔ اسی دوران دنیا کے دیگر مسلمان ممالک میں اسی فکر پر مبنی بہت سی تحاریک نے جنم لیا۔ البتہ بعض وجوہات کی بنا پر جب یہ تحریکیں وقتی طور پر ناکام ہوئیں تو کچھ عناصر نے اس فکر کو ع ’’کہتے ہیں جسے عشق خلل ہے دماغ کا‘‘ کے مصداق غلط قرار دے دیا اور اپنے ذہن و فکر کی پوری قوت کے ساتھ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ خدا کا دین انسانوں کا محتاج نہیں‘ اس لیے باقی ممالک کو ایک طرف رکھتے ہوئے برعظیم پاک و ہند کے تناظر میں دیکھا جائے تو حزب اللہ اور جماعت اسلامی کے بعد یہ جھنڈا تنظیم اسلامی نے تھاما۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ جیسی انقلابی شخصیت نے نہ صرف مسلمانانِ پاکستان بلکہ دنیا کے دیگر خطوں سے تعلق رکھنے والی عظیم مسلم اکثریت تک اسلام کا انقلابی پیغام پہنچایا۔ دینِ حق کے غلبہ کے لیے ’’تنظیم اسلامی‘‘ کی شکل میں ایک مضبوط اور منظم جماعت بھی قائم کی جو بانیٔ تنظیم کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی غلبۂ دینِ حق کے علم کو تھامے ہوئے اپنی مخصوص اور فطری رفتار کے ساتھ گامزن ہے۔ جس طرح پہلے کچھ لوگوں نے اس فکر سے انحراف کر کے اسے مجروح کرنے کی کوشش کی تھی اسی طرح آج بھی کچھ عناصر بانیٔ تنظیم کی تقاریر کے مختلف کلپس (clips) کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ احیائی تحریکیں کچھ عرصے بعد اپنے اصل مقصد سے ہٹ جاتی ہیں۔ ذیل میں اس حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے بیان کردہ وہ الفاظ تحریر

کیے جارہے ہیں جو ایک کلپ کی شکل میں سوشل میڈیا پر گردش کر رہے ہیں:

’’انقلابی تحریکوں کے بارے میں یہ قانونِ فطرت ہے کہ یہ یا تو تیس چالیس سال کے اندر اندر کامیاب ہو جائیں تو ہو جائیں ورنہ پھر بوڑھی ہو کر اُن کا وہ جوش وخروش‘ جذبہ قربانی‘ جوشِ عمل اور پھر یہ کہ ان چیزوں میں کمی آ کر مفاہمت اور مصالحت کا راستہ اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی پر جوانی کے بعد بڑھاپے کا دور آتا ہے۔ جوانی سدا تو نہیں رہتی‘ بڑھاپا آتا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ انقلابی (radical) تحریک جوش وجذبے کے ساتھ اُٹھے گی‘ لوگوں کو لے گی‘ لوگوں میں ایثار‘ قربانی سب کچھ ہوگا۔ تیس چالیس سال کے اندر یا تو کامیابی یا پھر بڑھاپا شروع ہو جائے گا۔

بڑھاپے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اب مفاہمت اور مصالحت شروع ہو جاتی ہے اور نتیجہ یہ کہ انقلابیت کا ڈنک ٹوٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ کوئی انتخابی میدان میں چلو‘ کہیں کوئی خاص اپنی مسجدیں بناؤ‘ اپنے مراکز بنالو۔ اس قسم کے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ بچائے اس کا سب سے بُرا نتیجہ نکلتا ہے فرقہ واریت کی شکل میں۔ اس طرح وہ تحریک ایک فرقہ بن جاتی ہے۔ ایک نسل نے تو اُس تحریک کی دعوت کو قبول کیا تھا ذہناً شعوری طور پر (consciously)۔ اب اُس کی اگلی نسل کا تعلق اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ یہ ہمارے باپ کا مسلک ہے۔ تیسری نسل میں آ کر یہ بالکل ایک فرقہ بن کر رہ جاتی ہے اور اُس کے بعد اُس کی حیثیت یہ ہو جاتی ہے کہ شخصی عقیدتیں تو باقی رہ جاتی ہیں لیکن وہ جذبہ‘ جوشِ عمل‘ قربانی اپنے آپ کو بدلنا اور اپنی زندگی میں کوئی انقلاب لانا اُس کے لیے آدمی تیار نہیں ہوتا۔ یہ اُس کا بدترین انجام ہوتا ہے اور فرقے وجود میں آتے ہی اسی طریقے سے ہیں۔ ہر فرقے کی آپ تاریخ اٹھائیں تو معلوم ہوگا کہ شروع میں تو صاحب عزیمت انسان اُٹھے تھے اور انہوں نے اصلاحی کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ شرکیہ عقائد اور بدعات کے ردّ میں مختلف غلط چیزوں کے خلاف ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ ایک یا دو نسل کے بعد اب چند شعائر رہ گئے ہیں جن کے حوالے سے وہ فرقہ پہچانا جاتا ہے‘ باقی ساری چیزیں ختم۔ یہی ہے درحقیقت جس کو میں نے تعبیر کیا ہے کہ تیس چالیس سال میں یا کوئی انقلابی تحریک کامیاب ہوگی اور اگر کامیاب نہ ہوگی تو اُس پر بڑھاپے کے آثار طاری ہو جائیں گے۔ نام پوجے جائیں گے‘ شخصیتیں پوجی جائیں گی اور اُن کے حوالے سے دکانیں چمکائی جائیں گی۔ کیریئر بنائے جائیں گے۔ وہ سب کچھ ہوگا لیکن وہ اصل

انقلابی (radical) تصور گم ہو جائے گا۔‘‘

درج بالا اقتباس میں سے تیس چالیس سال کے عرصہ والی بات کو فی الحال ایک طرف رکھیے دیگر وجوہات جو بیان کی گئی ہیں کہ اگر کسی تحریک میں اُن کا ظہور ہو جائے‘ جیسا کہ بعض تحاریک میں نظر بھی آتا ہے کہ اصل مقصد سے ہٹ کر کچھ دوسرے امور پر توجہ کا ارتکاز ہو گیا‘ جماعت جس مقصد کے تحت بنی تھی وہ پسِ پشت چلا گیا اور جماعت ہی اصل فرقہ کی شکل اختیار کرتی چلی گئی تو اس حد تک اُن کے موقف سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔ جہاں تک تنظیم اسلامی کا تعلق ہے‘ اُس کے متعلق بانیٔ تنظیم نے اپنی زندگی میں ہی بہت مواقع پر یہ بات بیان کی ہے کہ جن معنوں میں کوئی جماعت اپنی وسعت اور عوام کے اندر پزیرائی کے لحاظ سے جماعت کہلاتی ہے ابھی تک تنظیم اسلامی ان معنوں میں جماعت نہیں ہے بلکہ ہم اسے ایک جماعت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے اُن کی بات صد فیصد درست ہے کہ جس طرح جماعت اسلامی‘ جمعیت علماء اسلام یا اسی طرح کچھ اور بڑی جماعتیں ہیں‘ تنظیم اسلامی اُن کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ بانیٔ تنظیم اپنی ایک اہم تحریر ’’تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر‘‘ میں موجودہ احیائی مساعی کے تناظر میں تنظیم اسلامی کا محل ومقام‘‘ کے عنوان کے تحت احیائی عمل کے تین اہم گوشوں کا ذکر کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں:

’’اس احیائی عمل کے بارے میں بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں۔ مثلاً ایک یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں‘ جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرِ کار ہیں۔ بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے کے لیے باعث تقویت ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور ملتِ اسلامی کی تجدید کا یہ کام بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں ہے بلکہ ﴿لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿١٩﴾﴾ (الانشقاق) کے مصداق درجہ بدرجہ بہت سے مراتب ومراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور چاہے بعد کے مراحل سے گزر کر پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے‘ اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اس کی اہمیت و وقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی

جگہ مسلّم ہے تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہوجاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پہنائیوں میں گم ہوجاتی ہیں جوان سب کو محیط ہے۔‘‘

درج بالا اقتباس میں بانی تنظیم خود واضح کر رہے ہیں کہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور ملّتِ اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں اور اختتام اس جملہ سے کر رہے ہیں کہ تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جوان سب کو محیط ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ احیائی عمل چند برسوں تک محیط نہیں ہوتا بلکہ اس کو آخری منزل تک پہنچانے کے لیے کئی نسلوں کی محنت درکار ہوتی ہے۔ اگر اس احیائی عمل کے لیے قائم کی جانے والی جماعت اپنے فکر کی صحت وسلامتی‘ کارکنوں کے خلوص واخلاص اور انقلابی جذبے کے ساتھ اپنے مشن سے تعلق استوار رکھے تو وہ کبھی بھی بوڑھی نہیں ہوسکتی۔ اس حوالے سے محترم محی الدین غازی کی تحریر ’’جوان اسلامی تحریک کے خدوخال‘‘ سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’جوان تحریک ناسٹلجیا (nostalgia) سے دور رہتی ہے۔ ناسٹلجیا اس کیفیت کو کہتے ہیں جب آدمی حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے مایوس ہوکر ماضی کی حسین یادوں سے دل بہلاتا ہے۔ ناسٹلجیا بوڑھی تحریک کی علامت ہے۔ جوان تحریک اپنے موجود افراد میں خوبیوں کو تلاش کرتی ہے۔ ناسٹلجیا میں اچھے افراد ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے یا نگاہ کو نہیں بھاتے۔ اسلامی تحریک میں ایسی کیفیت کا پیدا ہونا اچھی علامت نہیں ہے۔ ماضی کی تابناک شخصیتوں اور کارناموں کا تذکرہ حال سے مایوس کرنے کے لیے ہرگز درست نہیں ہے‘ وہ حال کو جوش اور توانائی سے بھرنے کے لیے ہی درست ہوسکتا ہے۔ ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے ایک اور نکتہ کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ تحریک کو ویسا بنانا مطلوب نہیں ہے جیسا بانی تحریک نے بنایا تھا‘ بلکہ وہاں پہنچانا مطلوب ہے جہاں پہنچانے کا بانی تحریک نے خواب دیکھا تھا‘ یا اس سے بھی آگے‘ جہاں پہنچانے کا خواب آپ دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر تحریک کے سابقین سینما کے قریب نہیں پھٹکتے تھے لیکن ان کا خواب یہ تھا کہ سینما کو اسلام کے رنگ میں رنگ دیا جائے اور اسلام کی خاطر اس کا استعمال کیا جائے۔ اس لیے مطلوب وہ نہیں ہے جو وہ کرتے تھے بلکہ وہ ہے جس کا وہ خواب دیکھتے تھے‘ یا اُن کے خواب سے بھی آگے بڑھ کر جس کا خواب آپ دیکھتے

ہیں۔ اِسی طرح ماضی کی وہ روایات جن کا تعلق وسائل اور طریقہ کار سے ہے اُن کا زمانے کے ساتھ تبدیل ہونا فطری بات ہے۔ ٹھوس اصول اور ابدی اقدار کی پابندی پر اُکسانے والی روایات کو سینے سے لگانا مطلوب ہے۔‘‘

اس تحریر کی روشنی میں اگر تنظیم اسلامی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات مزید مبرہن ہوجاتی ہے کہ اس پر بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ ایک پُرعزم اور جوان تحریک کی مانند وہ اپنے مشن کے ساتھ تعلق جوڑتے ہوئے بانی تنظیم کے خواب کو عملی شکل دینے کے لیے کوشاں ہے۔ وہ اپنے حال سے بھی پوری طرح مطمئن ہے اور مستقبل کے حوالے سے بھی کسی قسم کی مایوسی کا شکار نہیں۔ اسلام کے انقلابی فکر کو ’’عضوا علیھا بالنواجذ‘‘ کے مانند اپنے دانتوں کے ساتھ مضبوطی سے تھام کر روایت اور جدیدیت میں اعتدال رکھتے ہوئے اپنے مشن پر جوان قائد کی قیادت میں رواں دواں ہے۔ جو چیزیں ۴۸ سال قبل طے کی گئی تھیں انہی کے ساتھ جڑ کر موافق و ناموافق ہر طرح کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اپنا سفر طے کر رہی ہے۔ گو کہ رفتار اتنی تیز نہیں جتنی ایک احیائی تحریک کی ہونی چاہیے لیکن جب حالات ہر اعتبار سے ناموافق ہوں اور اس احیائی فکر کو نہ جامد مذہبیت قبول کرے اور نہ ہی مادہ پرستانہ الحاد کے علمبردار کوئی راستہ دینے کے لیے تیار ہوں تو پھر یہ سُست رفتار بھی غنیمت ہے۔ بقول اقبال: ؎

مایوس نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

جس طرح کسی کرکٹ یا فٹ بال کے میچ کے دوران تماشائی کھلاڑیوں پر تنقید کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں تو اس صورتحال سے واسطہ ہی نہیں پڑا ہوتا جس سے وہ کھلاڑی دوچار ہوتے ہیں‘ بالکل اسی طرح جو افراد کسی احیائی تحریک کا حصّہ نہیں بنے اور اس راستے میں آنے والی مشکلات‘ مصائب اور رکاوٹوں سے اُن کا واسطہ نہیں پڑا ہوتا وہ بڑے پُرزور انداز میں تنقید کر رہے ہوتے ہیں کہ ۴۵ سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے لیکن آپ لوگوں نے ابھی کوئی واضح کامیابی حاصل نہیں کی۔ ایسے حضرات کے لیے بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی کتاب ’’برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل اور اُس سے انحراف کی راہیں‘‘ کے درج ذیل الفاظ میں بہت اہم رہنمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’اس سلسلے میں فی الوقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ دین کے ان اجتماعی اور تحریکی‘

یا بالفاظِ دیگر ''انقلابی'' تصورات کو برقرار رکھا جائے جو بہت طویل عرصے کے بعد از سرِ نو اجاگر ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ ایک جانب تو وقت کا ماحول اس کے ساتھ مطابقت اور موافقت نہیں رکھتا اور ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مرجاتی ہے یا رہتی ہے خام!

کے مصداق نہ زمین اسے غذا دیتی ہے نہ فضا' جبکہ دوسری جانب نہ صرف یہ کہ مختلف احیائی تحریکوں کی وقتی اور فوری ناکامیوں کے طبعی نتیجے کے طور پر ان افکار اور تصورات کی کریڈیبلٹی کو خطرہ لاحق ہے' بلکہ بعض شکست خوردہ ذہنیت کے حامل لوگ جو کسی داخلی یا خارجی سبب کے باعث ان تحریکوں کے ساتھ نہیں چل پائے اور یا خود علیحدہ ہو گئے یا نکال دیے گئے' ایک مریضانہ نفسیاتی ردِّعمل کے تحت اس فکر ہی کو مجروح کرنے پر تل گئے ہیں۔

اوپر دین کے اجتماعی اور عمرانی فکر' اور فرائض دینی کے تحریکی انقلابی تصور کے فروغ کی راہ کے موانع کے ضمن میں زمین اور فضا دونوں کی عدم موافقت کا جو ذکر آیا ہے وہ محض روا روی یا قلم کی روانی میں نہیں ہے' بلکہ ایک سوچی سمجھی تشبیہ ہے۔ اس لیے کہ ایک جانب مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے ذہنوں میں دین کا جو محدود اور جامد مذہبی تصور صدیوں کے تعامل کے باعث راسخ ہو چکا ہے' فی الواقع اب بنجر اور سنگلاخ زمین کے مانند ہے جو کسی حرکی اور انقلابی تصور کو غذا دینے سے انکاری اور اس کے فروغ کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے' جبکہ دوسری جانب مادہ پرستانہ افکار و نظریات' سیکولر نظام ریاست و سیاست' مخلوط اور اباحیت پسندانہ معاشرت و ثقافت جو اس وقت پورے کُرۂ ارضی کو اپنے لپیٹ میں لیے ہوئے ہے' یقیناً اس آسمان کے مانند ہے جو اسلام کے حقیقی اور جامع تصور کے ''شجرہ طیبہ'' کو پنپنے کی اجازت دینے سے انکاری ہے (یہ دوسری بات ہے کہ اسلام کے عالمی غلبے کی ''تقدیر مبرم'' ﴿وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ﴾ اور ﴿وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ﴾ کے علی الرغم پوری ہو گی)۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جیسے ہر چہار جانب افق پر زمین اور آسمان باہم بغلگیر نظر آتے ہیں' بالکل اسی طرح دین کا محدود مذہبی تصور اور عالمی سیکولر تہذیب بھی ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ اور ہم آغوش ہیں۔ اس لیے کہ سیکولر نظام کا تو اصل الاصول ہی یہ ہے کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ

> ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے وہ کامل ''رواداری'' کا مظاہرہ کرتا ہے کہ جملہ مذاہب کو تسلیم کرتے ہوئے ان سب کو اپنے پہلو میں جگہ دینے کے لیے تیار ہے۔ اسے کوئی خطرہ اور اندیشہ اگر ہے تو اسلام کے صرف اس اجتماعی تصور سے جو پوری زندگی پر اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اس کی جنگ اگر ہے تو صرف ان ''بنیاد پرست'' (fundamentalist) قوتوں سے جو اسلام کو دین و دنیا اور عبادت و سیاست دونوں دائروں میں حکمران کرنا چاہتی ہیں۔ رہا دین کا وہ محدود مذہبی تصور جو عبادات و رسومات' مسجد و مدرسہ اور خانقاہ تک محدود رہے اور Politico-Socio-Economic System سے بحث نہ کرے تو اس کی تو وہ پوری طرح سرپرستی کرنے پر ہمہ وقت آمادہ اور تیار ہے۔''

درج بالا اقتباس اس حقیقت کی نشاندہی کر رہا ہے کہ جس فکر کے راستے میں زمین اور آسمان سب سے بڑی رکاوٹ بن جائیں' کیونکہ گزشتہ چار سو سال سے دین کا اصل ڈھانچا نگاہوں سے اوجھل ہے اور اُس کی جگہ مادہ پرستانہ الحاد اور جامد مذہبیت نے نہ صرف برعظیم پاک و ہند بلکہ پوری دنیا میں اپنی جڑیں مضبوط کر لی ہوں تو اُس کا مقابلہ نہایت مشکل کام ہے۔ جس عمارت کو شکستہ اور بوسیدہ ہونے میں کم و بیش چار سو سال کا عرصہ لگا اور بالآخر بیسویں صدی کے آغاز میں ملّتِ اسلامیہ کا بوسیدہ قصر گویا دفعتاً زمین پر آ رہا اور اسلام اور مسلمان دونوں اپنے انحطاط کی آخری حدود کو پہنچ گئے تو اُس کی تعمیر یکدم کیسے ممکن ہے! یہ ایک آفاقی سچائی ہے کہ تخریب کا کام آسان ہے جبکہ تعمیر کا کام مشکل ترین ہے۔

عالمی سطح پر غلبۂ دین کی جو خوشخبری احادیث مبارکہ میں دی گئی ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت اسلامی احیائی تحریکوں کے لیے گو کہ حالات بہت مشکل ہیں' نائن الیون کے بعد سامراجی قوتوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ان تحاریک کو بدنام کرنے کے لیے دہشت گردی کا ہوا کھڑا کرنے کی کوشش بھی کی لیکن دو سال قبل افغانستان میں ان قوتوں کی ہزیمت ناک شکست نے احیائی تحاریک کا مورال جس طرح بلند کیا ہے اسی طرح آئندہ اس میں مزید بہتری آنے کے امکانات بھی ہیں۔ البتہ احیائی تحریکوں کو بھی اپنی کمزوریوں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھنا ہوگا۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر محمد شفیق اپنی تحریر بعنوان ''اسلامی تحریکیں: حال اور مستقبل'' کے آخری پیراگراف میں لکھتے ہیں:

> ''اسلامی تحریکات کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنے

ادھورے کاموں کو مکمل کرنے اور عصرِ حاضر میں اسلامی تعمیر نو کے تقاضوں کو پہچان کر انہیں پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی فیصلہ کن ہوگی کہ گزشتہ نصف صدی کی تاریخ نے تحریک کے فرد اور لائحہ عمل میں جن نقائص اور کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے' اُن کو پہچاننے اور دور کرنے میں تحریک کی نئی قیادت کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔ یہ نئی قیادت بانیانِ تحریک کی مقلدِ محض ثابت ہوتی ہے یا انہی کی طرح اجتہادی فکر سے کام لیتی ہے۔ مستقبل کی تعمیر میں اس کی نگاہیں اپنے ماضی کی طرف رہتی ہیں اور وہ اس سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتی ہے یا معاصر حالات کے تجزیے اور مستقبل کے بارے میں مبنی بر بصیرت اندازوں کی روشنی میں لائحہ عمل اختیار کرتی ہے۔ تحریکات کے لیے ایک راہ' راہِ جمود ہے' دوسری اقدام و اجتہاد کی۔ یہی دوسرا راستہ کامیابی کا ضامن ہوسکتا ہے۔''

اس تحریر کی روشنی میں تنظیم اسلامی کا لائحہ عمل واضح ہے کہ بانی تنظیم کے دیے ہوئے فکر پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ساتھ ساتھ اُن کی تقلیدِ محض نہیں کی جائے گی بلکہ حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد بھی کیا جائے گا۔ بانی تنظیم کے علمی تفردات یا سیاسی آراء سے بھی جہاں ممکن ہوا' اختلاف کیا گیا البتہ بنیادی اصولوں سے تعلق کبھی بھی منقطع نہیں کیا گیا' چاہے وہ عقائد دینی نظریات ہوں یا تنظیم کا اساسی فکر۔

بعض ایسے عناصر ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف انداز سے افواہیں پھیلا کر رفقاء واحباب کے اذہان کو مسموم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ عمر کے آخری حصہ میں تنظیم سے مایوس ہو چکے تھے اور یہ سمجھنے لگ گئے تھے کہ تنظیم اسلامی اب اپنے اصل فکر پر نہیں رہی۔ ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ رفقاء تنظیم تذبذب کا شکار ہو جائیں اور جم کر دین کا کام نہ کرسکیں۔ اُن کی تشفی کے لیے بانی تنظیم کی وفات سے چند روز قبل فیصل آباد میں سوال وجواب کی آخری نشست کے موقع پر ایک سوال کے جواب میں بیان کیے گئے یہ الفاظ کافی ہیں:

''میرے دل سے تو یہی دعا نکلے گی کہ یہ تحریک پھلے پھولے' برگ وبار لائے اور امید ہے اس لیے کہ جہاں تک معلوم ہے پوری دنیا میں اتنی صحیح کوئی تحریکِ اسلامی موجود نہیں۔ یہ بات میں نے جماعت اسلامی کے بارے میں لکھی تھی اور آج بھی سمجھتا ہوں کہ جماعت اسلامی ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء تک دورِ صحابہؓ کے بعد کی بہترین اسلامی

تحریک تھی' کوئی تحریک بھی اس کے قریب نہیں تھی لیکن افسوس جو انہوں نے سیاست کی طرف رخ موڑا ہے وہ بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس بہت دیر میں ہوا۔ آج میں علیٰ وجہ البصیرت کہہ رہا ہوں کہ تحریکیں تو بہت سی ہیں لیکن خالص منہج انقلابِ نبوی ﷺ پر کوئی اور تحریک نہیں سوائے تنظیم اسلامی کے۔''

تنظیم اسلامی کا قیام ۱۹۷۵ء میں عمل میں آیا تھا اور بانی تنظیم کے مذکورہ بالا الفاظ ۲۰۱۰ء کے ہیں جب تنظیم کو قائم ہوئے ۳۵ برس ہو چکے تھے۔ مضمون کے آغاز میں بانی تنظیم کے جس ویڈیو کلپ کا حوالہ دیا گیا ہے وہاں انقلابی تحریکوں کی کامیابی کے تیس یا چالیس کے عرصہ کا ذکر تھا جسے بنیاد بنا کر یہ پراپیگنڈہ کرنے کی کوشش کی گئی کہ تنظیم اسلامی بھی اب اپنی عمر پوری کر چکی ہے۔ یہاں بانی تنظیم خود تنظیم کے قیام کے ۳۵ برس بعد بھی یہ فرما رہے ہیں کہ دنیا میں اور بہت سی تحریکوں اور جماعتوں کے باوجود صرف تنظیم اسلامی ہی ایک ایسی جماعت ہے جو خالصتاً منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہے اور اتنی صحیح کوئی تحریک اسلامی موجود نہیں ہے۔ پھر اس کے پھلنے پھولنے اور برگ و بار لانے کے لیے خلوصِ دل سے دعا بھی فرما رہے ہیں۔ اپنی ہی زندگی کے آخری ایام میں تنظیم اسلامی کے متعلق ان مثبت خیالات اور دعاؤں کے بعد بھی اگر کسی کے ذہن میں تنظیم' اس کی قیادت اور رفقاء کے بارے میں منفی خیالات ہیں تو اسے اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا وہ یہ تنقید داخلی احساس اور شعوری تنبیہہ کے ساتھ نصح وخیر خواہی کے جذبہ کے تحت کر رہا ہے یا صرف توہین و تذلیل اور تمسخر و استہزا پیشِ نظر ہے!

دونوں صورتوں میں بہر حال اُس نے ایک دن اپنے رب کے ہاں جواب دہی کے لیے پیش ہونا ہے۔ وہاں احکم الحاکمین کی عدالت میں تمام فیصلے عدل پر مبنی ہوں گے اور نیتوں کے بھید کھل جائیں گے۔ اگر نیت میں اخلاص ہوگا تو اُس کا اچھا بدلہ مل جائے گا جبکہ نیت میں فتور کا نقصان بہت زیادہ ہوگا۔ اگر ہمارے اندر آخرت پر صحیح معنوں میں یقین قلبی والا ایمان پیدا ہو جائے تو کسی شخصیت' ادارے یا جماعت پر تنقید کرنے سے پہلے تمام امور کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لیتے ہوئے یہ خدمت سرانجام دے سکیں گے تاکہ ہمیشہ والی ناکامی سے بچ سکیں۔

❁❁❁

توکّل علی اللہ کی برکات

حافظ محمد اسد☆

’’توکّل‘‘ کی تعریف کے بارے میں ائمہ سلف سے مختلف اقوال ملتے ہیں‘ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پر بھروسا کرنے اور مخلوق سے تمام توقعات ہٹا لینے کو ’’توکّل‘‘ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ’’دارالامتحان‘‘ بنایا ہے اور یہاں ہر کام اس کی مشیت ورضا ہی سے ہو رہا ہے۔ ہمارا عقیدہ تو یہی ہے کہ ساری دُنیا کے انسان مل کر بھی کسی فردِ واحد کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے جب تک باری تعالیٰ کا حکم نہ ہو‘ لیکن آج کا مسلمان یہ جاننے کے باوجود اپنے طرزِ عمل سے اس حقیقت سے انکاری نظر آتا ہے۔ اُسے اپنی صلاحیتوں اور کاوشوں پر اس قدر ناز ہے کہ ربّ تعالیٰ کی ذاتِ اَقدس کی عطا سے صرفِ نظر کرتا ہے اور اُس کے اَن گنت احسانات اور انعامات کو یک لخت فراموش کر دیتا ہے۔ اپنی کامیابی اور عروج کا حاصل اپنی فہم و فراست اور عقل ودانش ہی کو قرار دیتا ہے۔ دوسری طرف‘ ایک ناکام شخص بھی اپنی محرومیوں کا ملبہ دوسروں پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ دراصل اسباب تو ہمیں اختیار کرنے چاہئیں لیکن ہمارا بھروسا اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے۔ یہ عقیدہ پختہ رکھنا چاہیے کہ وہ ذات اسباب کے بغیر بھی چیزوں کو وجود میں لاسکتی ہے جبکہ اسباب کی موجودگی کے باوجود بھی اُس کے حکم کے بغیر کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔

’’توکّل علی اللہ‘‘ کی صفت اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بندہ یہ تصوّر کرے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ میرے تمام معاملات کا کفیل ہے۔ وہ ذاتِ اَقدس علیم وبصیر ہے‘ قادرِ مطلق ہے اور نسیان جیسے امراض سے پاک ہے۔ ہر نقص وعیب سے منزہ ہے۔ جب ہمارے ذہن میں یہ تصوّر دائمی طور پر رہے گا تو یقیناً تمام معاملات کے بارے میں توکّل کی حقیقت کا شعور ہمیں حاصل ہو جائے گا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اسباب کے ساتھ جوڑا

☆ استاذ قرآن اکیڈمی‘ یٰسین آباد‘ کراچی

ہے۔ یہی یقین کامل رکھنا ہمارا امتحان اور آزمائش ہے۔ اگر اسباب کے ساتھ مسبب الاسباب پر نظر رکھی جائے تو کامیابی ملے گی۔ اللہ کے رسول ﷺ سے ہر ہر موقع پر جو مناجات اور دعائیں منقول ہیں‘ ان میں مذکور کام اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ چناں چہ آپ ﷺ جب کھانا تناول فرماتے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی ھُوَ أَشْبَعَنَا وَأَرْوَانَا وَأَنْعَمَ عَلَیْنَا وَأَفْضَلَ)) (رواہ الحاکم)

’’تمام شکر اور تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے میری بھوک کو مٹایا‘ پیاس کو بجھایا اور مجھ پر انعام اور فضل فرمایا۔‘‘

یعنی اے اللہ! بھوک تیرے حکم سے مٹی ہے اور پیاس تیرے حکم سے بجھ گئی ہے۔ گویا یہ یقین کامل ہے کہ بھوک اور پیاس کھانے یا پینے سے ختم نہیں ہوئی۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم کھا پی کر بھی سیراب نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی طرح جناب نبی کریم ﷺ جب سفر مبارک کا ارادہ فرماتے تو یہ دعا پڑھتے:

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقۡرِنِیۡنَ ﴿۱۳﴾ وَاِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ (الزخرف)

’’پاک ہے وہ ذات جس نے اس (سواری) کو ہمارے بس میں کر دیا‘ حالانکہ ہمیں اسے قابو کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اور بالیقین ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔‘‘

یعنی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے‘ ہمارے پاس کوئی طاقت نہیں کہ ہم اُس کے اِذن کے بغیر کچھ کر سکیں۔

یہی وہ طریقہ تعلیم تھا جس نے دشمنوں کو دوست بنا دیا‘ جس نے تاریکیوں میں پڑے ہوئے لوگوں کو ہدایت کا نور اور راہ نجات عطا فرمائی۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر عبادات‘ معاملات اور عقائد کے ضمن میں ’’توکّل علی اللہ‘‘ کا ذکر لازمی طور پر کیا گیا ہے۔ اسی طرح احادیث مبارکہ بھی ’’توکّل‘‘ کی اہمیت اور فضائل کو بڑے جامع انداز میں بیان کرتی ہیں۔ غزوۂ بدر کو حق وباطل کی فیصلہ کن جنگ قرار دیا گیا اور قرآن کریم نے اسے ’’یوم الفرقان‘‘ قرار دیا۔ اس غزوہ میں کفار کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی‘ وہ بھی جنگی ساز وسامان سے لیس۔ مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے جنہیں جنگی ہتھیار بھی میسّر نہیں تھے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ

اس معرکہ کے لیے میدان میں اترنا ہے۔ شیطان اپنے لشکر کو تعداد کے گھمنڈ میں مبتلا کر رہا تھا اور ''لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ'' (آج کے دن تم پر کوئی غالب نہ ہوگا) کے نعرے لگوا کر دھوکا دے رہا تھا۔ دوسری طرف رب تعالیٰ اپنے محبوب جناب نبی کریم ﷺ کو اطمینان دلا رہا تھا کہ آج آپ اپنے خالق پر بھروسا کر کے اپنے صحابہ کرامؓ کو میدان میں اتاریے‘ ہماری مدد آپ ﷺ کے ساتھ ہوگی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ساری دنیا کے سامنے کھلی کتاب کی طرح عیاں ہے۔ ۳۱۳ نیم مسلح مجاہدوں نے پورے طور پر مسلح اور جنگی ساز و سامان سے آراستہ ایک ہزار کے لشکر کو بری طرح شکست دی اور ایک ایسی عظیم الشان فتح حاصل کی جس نے تاریخ کا رخ ہی بدل دیا۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا وہ مقدس گروہ جس نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے پیغام کو دنیا تک پہنچانے کا فریضہ باحسن خوبی ادا فرمایا‘ ان کی زندگیاں بھی ''توکّل علی اللہ'' سے عبارت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ (ابراھیم)

''آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر بھروسا نہ رکھیں جبکہ اُسی نے ہمیں ہماری راہیں سجھائی ہیں۔ واللہ جو ایذائیں تم ہمیں دو گے ہم ان پر صبر ہی کریں گے‘ اور توکّل کرنے والوں کو یہی لائق ہے کہ اللہ ہی پر توکّل کریں۔''

﴿رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۴﴾﴾ (الممتحنة)

''اے ہمارے رب! تجھی پر ہم نے بھروسا کیا ہے اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔''

﴿قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ﴾ (الملک:۲۹)

''آپ کہہ دیجیے کہ وہی رحمٰن ہے‘ ہم تو اس پر ایمان لا چکے اور اسی پر ہمارا بھروسا ہے۔''

نیز نبی رحمت ﷺ اور ان کے پیروکاروں کو حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾﴾ (الانفال)

''اے نبیؐ! آپ کو اللہ کافی ہے اور ان مومنوں کو جو آپؐ کی پیروی کر رہے ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپؐ کے لیے اور آپؐ کے پیروکار مومنوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات کافی ہے‘ اُس کی ذاتِ اقدس

کے علاوہ آپؐ کو کسی اور کی کوئی ضرورت نہیں۔

نبی کریم ﷺ نے بھی اپنی سیرت و کردار سے ایسے ہی نمونے پیش فرمائے۔ حدیث شریف میں وارد ہے‘ حضرت جابرؓ نے خبر دی کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ اطرافِ نجد میں غزوہ کے لیے گئے تھے۔ پھر جب نبی کریم ﷺ واپس ہوئے تو وہ بھی واپس ہوئے۔ ایک وادی میں قیلولہ کا وقت آیا جہاں ببول کے درخت تھے۔ نبی کریم ﷺ وہیں اتر گئے اور صحابہؓ درختوں کے سائے کے لیے پوری وادی میں پھیل گئے۔ آپ ﷺ نے بھی ایک ببول کے درخت کے نیچے قیام فرمایا اور اپنی تلوار اس درخت پر لٹکا دی۔ جابرؓ نے بیان کیا کہ ابھی ہمیں سوئے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں پکارا۔ ہم جب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپؐ کے پاس ایک بدوی بیٹھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے میری تلوار (مجھ ہی پر) سونت لی تھی۔ مَیں اُس وقت سویا ہوا تھا‘ میری آنکھ کھلی تو میری ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تمہیں میرے ہاتھ سے آج کون بچائے گا؟ مَیں نے تین مرتبہ ''اللہ'' کہا! اب دیکھو یہ (نہتا) بیٹھا ہوا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے پھر کوئی سزا نہیں دی۔ (صحیح بخاری‘ غزوہ ذات الرقاع کا بیان‘ حدیث: ۴۱۳۵)

خلیل اللہ سیدنا ابراہیمؑ کی زندگی توکّل علی اللہ کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ آتش نمرود میں ڈالے جانے کا حکم ہوا تو ملائکہ ششدر رہ گئے اور ان کی مدد کرنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ لہٰذا پانی کے فرشتے نے مدد کی اجازت چاہی‘ اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی کہ جاؤ اگر ابراہیم (ؑ) تمہاری مدد لینا قبول کریں تو مدد کر سکتے ہو۔ وہ فرشتہ آیا اور پانی سے آگ سرد کرنے کی اجازت چاہی۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا: کیا آپ کو اللہ نے اس کام کے لیے بھیجا ہے؟ فرشتے نے کہا: نہیں‘ بلکہ مَیں خود اجازت لے کر حاضر ہوا ہوں۔ یہ سن کر خلیل اللہؑ نے فرمایا: جب میرے رب کو میرا حال معلوم ہے‘ پھر بھی اُس نے خود نہیں بھیجا تو مجھے آپ کی اعانت درکار نہیں۔ میرا رب میرے حال کو جانتا ہے اور مجھے اُس کی ذات پر بھروسا و اعتماد ہے۔ یہ تھی توکّل علی اللہ کی شان!

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے آگ میں ڈالے جانے کے وقت جو آخری بات کہی تھی‘ وہ ''حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ'' تھی اور یہی جملہ

رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احد کے موقع پر کہا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ’’جنہیں لوگوں نے کہا کہ بے شک لوگ (دشمن) تمہارے لیے جمع ہو گئے ہیں‘ لہٰذا ان سے ڈرو‘ تو اس بات نے ان کو ایمان میں بڑھا دیا اور وہ کہنے لگے: ہمارے لیے اللہ کافی اور وہی بہترین کارساز ہے۔‘‘
(آلِ عمران ۱۷۳۔ صحیح بخاری)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ذہن میں لائیے کہ جب فرعون کا لشکر پیچھے تھا اور آگے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر‘ تو حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کے ساتھیوں کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا: موسیٰ اب بتاؤ کیا کریں؟ ہم تو پکڑ لیے گئے۔ آگے بحر قلزم ہے‘ پیچھے فرعون کا ٹڈی دَل لشکر۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن! ظاہر ہے کہ نبی اور غیر نبی کا ایمان یکساں نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت ٹھنڈے دل سے جواب دیا:

﴿كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾﴾ (الشعراء)

’’ہرگز نہیں! یقین مانو‘ میرا رب میرے ساتھ ہے جو ضرور مجھے راہ دکھائے گا۔‘‘

مطلب یہ کہ گھبراؤ نہیں‘ تمہیں کوئی ایذا نہیں پہنچ سکتی۔ میں اپنی رائے سے تمہیں لے کر نہیں نکلا‘ بلکہ ’’احکم الحاکمین‘‘ کے حکم سے چلا ہوں۔ وہ وعدہ خلاف نہیں ہے۔ لشکر کے اگلے حصے پر حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔ گھبراہٹ کے مارے اور راہ نہ ملنے کی وجہ سے سارے بنو اسرائیل ہکا بکا ہو کر ٹھہر گئے اور اضطراب کے ساتھ جناب کلیم اللہ سے دریافت فرمانے لگے کہ: اللہ کا حکم اسی راہ پر چلنے کا تھا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اتنی دیر میں فرعون کا لشکر سر پر آ پہنچا۔ اسی وقت پروردگار کی وحی آئی کہ اے موسیٰ اس دریا پر اپنی لاٹھی مارو اور پھر میری قدرت کا کرشمہ دیکھو۔ چنانچہ آپ نے لکڑی مار کر فرمایا کہ اللہ کے حکم سے تو پھٹ جا اور مجھے چلنے کا راستہ دے دے۔ اسی وقت وہ سمندر پھٹ گیا اور پانی پہاڑی تودوں کی مانند کھڑا ہو گیا۔ اس میں بارہ راستے نکل آئے۔ بنو اسرائیل کے قبیلے بھی بارہ ہی تھے۔ پھر قدرتِ الٰہی سے ہر دو فریق کے درمیان جو پہاڑ حائل تھا اس میں طاق سے بن گئے تاکہ ہر ایک دوسرے کو سلامت روی سے آتا ہوا دیکھے۔ پانی مثل دیواروں کے ہو گیا۔ ہوا کو حکم ہوا اور اس نے درمیان سے پانی کو اور زمین کو خشک کر کے راستے صاف کر دیے۔ پس اس خشک راستے سے آپ مع اپنی قوم کے بے کھٹکے گزر گئے۔ فرعون اور اس کے لشکروں نے انہی راستوں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا تعاقب کرنا چاہا مگر ٹھہرا

ہوا پانی جاری ہو گیا۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو تو نجات مل گئی مگر باقی سب کافروں کو اللہ تعالیٰ نے ڈبو دیا۔

توکّل کی اہمیت اور اُخروی فوائد

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:
((لَوْ اَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ، تَغْدُوْا خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا)) (رواہ الترمذی واحمد)

’’اگر تم اللہ پر کما حقہ توکّل کرتے تو وہ تم کو ایسے رزق دیتا جیسا کہ پرندوں کو دیتا ہے‘ جو صبح خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو شکم سیر واپس ہوتے ہیں۔‘‘

اس حدیث میں بھی اسباب و وسائل اختیار کرنے کی ترغیب ہے کہ پرندہ صبح کو جب اپنے گھونسلے سے نکلتا ہے تو اسے اپنے رب پر یقین کامل ہوتا ہے کہ میری کوششوں کے بعد اللہ عزوجل جو سب کا رازق ہے‘ مجھے بھی ضرور رزق عطا فرمائے گا۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’میری اُمت کے ستر ہزار افراد بغیر حساب وعذاب کے جنّت میں داخل ہوں گے۔‘‘ پوچھا گیا: یارسول اللہ ﷺ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جو آگ سے نہیں دغواتے‘ جھاڑ پھونک نہیں کرواتے‘ بدفالی نہیں لیتے اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔‘‘ (صحیح مسلم)

ان تمام فضائل قرآن وسنّت اور اقوال کی روشنی میں یہ باتیں سمجھنی چاہئیں کہ:

(۱) توکّل کرنے والا شخص سکون اور اطمینان میں رہتا ہے۔
(۲) توکّل کرنے والا شخص مخلوق سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔
(۳) توکّل کرنے والے شخص کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ غیب سے رزق عطا فرماتے ہیں۔
(۴) توکّل کرنے والے شخص کا ایمان محفوظ ہو جاتا ہے۔
(۵) توکّل کرنے والے شخص کو بے شمار بھلائیاں اور رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے۔
(۶) توکّل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ایمان محفوظ ہو جاتا ہے‘ کیونکہ شیطان جب کسی کے ایمان پر حملہ آور ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر یقین اور بھروسا کمزور کر دیتا ہے۔

(باقی صفحہ 67 پر)

تکبّر: اسباب اور علاج

احمد علی محمودی

تکبّر کا معنی و مفہوم

لفظ کِبْر (حرفِ کاف کے زیر اور باء کے جزم کے ساتھ) سے مراد ہے ''بڑا بننا'' اور ''عظمت سے متصف ہونا''۔ اسے تکبر اور استکبار (بڑا سمجھنا) سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ جس کے دل میں تکبر پایا جائے اسے متکبر اور مغرور کہا جاتا ہے۔ اس کی ضد تواضع اور انکساری آتی ہے۔ لفظ کِبَر' (حرفِ باء کے زبر کے ساتھ) سے مراد ہے ''عظمت وجلالت'' اور اس کی ضد آتی ہے صِغَر۔ کِبَر کا اصل معنی ہے 'باز رہنا'' اور ''اطاعت نہ کرنا۔''

امام راغب اصفہانی ؒ لکھتے ہیں:

((ذٰلِکَ اَنْ یَّرَی الْاِنْسَانُ نَفْسَہٗ اَکْبَرَ مِنْ غَیْرِہٖ)) (المفردات: ص۴۹۷)

''تکبر یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے افضل سمجھے۔''

امام غزالی ؒ تحریر فرماتے ہیں:

''تکبر یہی ہے کہ تم دوسروں کو کم تر اور حقیر جانو۔ ان کی تحقیر وتذلیل کرو۔ ان سے دور رہو۔ ان کے ساتھ ان کے برتنوں میں کھانا پینا برا سمجھو بلکہ اپنے برتن انہیں استعمال نہ کرنے دو۔ وہ راستوں میں برابر چلیں، مجلسوں میں اونچی جگہ بیٹھیں تو تمہیں سخت ناگوار ہو۔ تمہیں کوئی نصیحت کرے تو نفس پر سخت چوٹ لگے۔ تم ناک بھوں چڑھاؤ' تلخ اور طعن آمیز جواب دو اور نصیحت کرنے والے کی تذلیل کرو۔ خود نصیحت کرنے لگو تو سخت مزاجی سے کرو۔ غلطی کرنے والے کو ٹوکنے لگو تو درشتی کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کرو اور طالب علم پر نرمی نہ کرو۔'' (احیاء العلوم)

تکبّر: قرآنی آیات کی روشنی میں

(۱) ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَ

کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۳۴﴾ (البقرہ)

''اور یاد کرو جب ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے سوائے ابلیس کے۔ اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا۔ اور ہو گیا وہ کافروں میں سے۔''

(۲) ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُہٗ جَہَنَّمُ ط وَلَبِئْسَ الْمِہَادُ ﴿۲۰۶﴾﴾ (البقرہ)

''اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو جھوٹی عزتِ نفس اس کو گناہ پر اور جما دیتی ہے۔ سو اُس کے لیے جہنم کافی ہے اور یقیناً وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔''

(۳) ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ﴿۳۶﴾﴾ (النساء)

''اللہ بالکل پسند نہیں کرتا اُن لوگوں کو جو شیخی خورے اور اکڑنے والے ہوں۔''

(۴) ﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْتَنْکَفُوْا وَاسْتَکْبَرُوْا فَیُعَذِّبُہُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ وَّلَا یَجِدُوْنَ لَہُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۱۷۳﴾﴾ (النساء)

''اور جنہوں نے (عبدیت کے اندر) عار محسوس کی تھی اور تکبر کیا تھا تو ان کو وہ دردناک عذاب دے گا۔ اور وہ نہ پائیں گے اپنے لیے اللہ کے مقابلے میں کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔''

(۵) ﴿اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْہُوْنِ بِمَا کُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ وَکُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِہٖ تَسْتَکْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾﴾ (الانعام)

''آج تمہیں ذِلّت کا عذاب دیا جائے گا بسبب اس کے جو تم کہتے رہے تھے اللہ کی طرف منسوب کر کے ناحق باتیں اور جو تم اللہ کی آیات سے متکبرانہ اعراض کرتے رہے تھے۔''

(۶) ﴿وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْہَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾﴾ (الاعراف)

''اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور تکبر کی بنا پر انہیں ردّ کر دیں گے وہی جہنمی ہوں گے' اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

(۷) ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْہَا لَا تُفَتَّحُ لَہُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ط وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۴۰﴾﴾ (الاعراف)

''یقیناً جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کی بنا پر ان کو ردّ کر دیا' ان کے لیے آسمان کے دروازے کبھی نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے'

یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکا میں سے گزر جائے اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں مجرموں کو۔‘‘

(۸) ﴿وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا یَّعۡرِفُوۡنَہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ قَالُوۡا مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡکُمۡ جَمۡعُکُمۡ وَمَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾﴾ (الاعراف)

’’اور پکاریں گے اہلِ اعراف (اہلِ جہنم میں سے) ان لوگوں کو جنہیں وہ پہچانتے ہوں گے ان کی نشانی سے‘ کہیں گے کہ تمہارے کچھ کام نہ آئی تمہاری جمعیت اور (نہ وہ) جو کچھ تم تکبر کیا کرتے تھے۔‘‘

(۹) ﴿قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِمَنۡ اٰمَنَ مِنۡہُمۡ اَتَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرۡسَلٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلَ بِہٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا بِالَّذِیۡۤ اٰمَنۡتُمۡ بِہٖ کٰفِرُوۡنَ ﴿۷۶﴾﴾ (الاعراف)

’’آپ کی قوم کے متکبر سرداروں نے ان لوگوں سے کہا جو دبا لیے گئے تھے (اور) جو ان میں سے ایمان لے آئے تھے کہ (واقعی) کیا تم لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ (ہاں) ہم تو جو کچھ ان کو دے کر بھیجا گیا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ (اس پر) وہ استکبار کرنے والے کہتے کہ جس چیز پر تم ایمان لائے ہو ہم اُس کے منکر ہیں۔‘‘

(۱۰) ﴿فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمُ الطُّوۡفَانَ وَالۡجَرَادَ وَالۡقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۟ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا وَکَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۳۳﴾﴾ (الاعراف)

’’پھر ہم نے بھیجے ان کے اوپر طوفان اور ٹڈی دَل اور چیچڑیاں اور مینڈک اور خون‘ (ہم نے بھیجیں یہ) نشانیاں وقفے وقفے سے۔ (اس کے باوجود) وہ تکبر پر اڑے رہے اور وہ تھے ہی مجرم لوگ۔‘‘

(۱۱) ﴿سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰیٰتِیَ الَّذِیۡنَ یَتَکَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ وَاِنۡ یَّرَوۡا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡا بِہَا ۚ وَاِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الرُّشۡدِ لَا یَتَّخِذُوۡہُ سَبِیۡلًا ۚ وَاِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الۡغَیِّ یَتَّخِذُوۡہُ سَبِیۡلًا ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوۡا عَنۡہَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾﴾ (الاعراف)

’’مَیں پھیر دوں گا اپنی آیات سے ان لوگوں (کے رُخ) کو جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں۔ اور اگر وہ دیکھ بھی لیں ساری نشانیاں تب بھی وہ ان پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور اگر

وہ دیکھ بھی لیں ہدایت کا راستہ تب بھی اس راستے کو اختیار نہیں کریں گے اور اگر وہ دیکھیں بُرائی کا راستہ تو اسے وہ (فوراً) اختیار کرلیں گے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے تغافل برتتے رہے۔‘‘

(۱۲) ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَیُسَبِّحُوۡنَہٗ وَلَہٗ یَسۡجُدُوۡنَ ﴿۲۰۶﴾﴾ (الاعراف)

’’بے شک وہ جو آپ کے ربّ کے پاس ہیں وہ اُس کی عبادت سے استکبار نہیں کرتے اور اُس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں‘ اور اُس کے لیے سجدے کرتے رہتے ہیں۔‘‘

(۱۳) ﴿ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ مُّوۡسٰی وَہٰرُوۡنَ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِہٖ بِاٰیٰتِنَا فَاسۡتَکۡبَرُوۡا وَکَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِیۡنَ ﴿۷۵﴾﴾ (یونس)

’’پھر بھیجا ہم نے ان کے بعد موسٰی اور ہارون (علیہما السلام) کو فرعون اور اس کے سرداروں کی جانب اپنی نشانیوں کے ساتھ‘ تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ تھے مجرم لوگ۔‘‘

(۱۴) ﴿لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡتَکۡبِرِیۡنَ ﴿۲۳﴾﴾ (النحل)

’’کوئی شک نہیں کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں اور جو کچھ وہ چھپاتے ہیں۔ یقیناً وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

(۱۵) ﴿فَادۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ فَلَبِئۡسَ مَثۡوَی الۡمُتَکَبِّرِیۡنَ ﴿۲۹﴾﴾ (النحل)

’’اب تم داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں‘ اسی میں ہمیشہ ہمیش رہنے کے لیے۔ پس کیا ہی بُرا ٹھکانہ ہے متکبرین کا۔‘‘

(۱۶) ﴿وَلَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا ۚ اِنَّکَ لَنۡ تَخۡرِقَ الۡاَرۡضَ وَلَنۡ تَبۡلُغَ الۡجِبَالَ طُوۡلًا ﴿۳۷﴾﴾ (بنی اسرائیل)

’’اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو‘ نہ تو تم زمین کو پھاڑ سکو گے اور نہ ہی پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکو گے۔‘‘

(۱۷) ﴿ثَانِیَ عِطۡفِہٖ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ لَہٗ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّنُذِیۡقُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ﴿۹﴾﴾ (الحج)

’’(تکبر سے) اپنی کروٹ موڑ کر (چل دیتا ہے) تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے گمراہ

کردے۔ اُس کے لیے دنیا میں رسوائی ہے‘ اور قیامت کے دن ہم اُسے جلانے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔‘‘

(۱۸) ﴿ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی وَاَخَاهُ هٰرُوۡنَ ۬ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَكَانُوۡا قَوۡمًا عَالِيۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ (المؤمنون)

’’پھر ہم نے بھیجا موسیٰ اور اُس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور روشن سند کے ساتھ‘ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف‘ تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ بڑے سرکش لوگ تھے۔‘‘

(۱۹) ﴿مُسۡتَكۡبِرِيۡنَ ۖۗ بِهٖ سٰمِرًا تَهۡجُرُوۡنَ ﴿۶۷﴾﴾ (المؤمنون)

’’پیغمبرؐ کو قصہ گو سمجھتے ہوئے تکبر کرتے ہوئے چھوڑ جاتے تھے۔‘‘

(۲۰) ﴿وَقَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا الۡمَلٰٓئِكَةُ اَوۡ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسۡتَكۡبَرُوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ وَعَتَوۡ عُتُوًّا كَبِيۡرًا ﴿۲۱﴾﴾ (الفرقان)

’’اور کہتے ہیں وہ لوگ جو ہماری ملاقات کے امیدوار نہیں ہیں کہ کیوں نہیں اتارے جاتے ہم پر فرشتے یا ہم خود اپنے رب کو دیکھیں۔ انہوں نے اپنے آپ میں بہت زیادہ تکبر کیا ہے اور وہ بہت بڑی سرکشی کے مرتکب ہوئے ہیں۔‘‘

(۲۱) ﴿وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ قَالُوۡا وَمَا الرَّحۡمٰنُ ۗ اَنَسۡجُدُ لِمَا تَاۡمُرُنَا وَزَادَهُمۡ نُفُوۡرًا ﴿۶۰﴾﴾ (الفرقان)

’’اور جب اُن سے کہا جاتا ہے سجدہ کرو رحمٰن کو تو وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن کون ہے؟ کیا ہم اُسے سجدہ کریں جس کے لیے تم ہمیں حکم دے رہے ہو! اور اس نے بڑھا دیا انہیں نفرت میں۔‘‘

(۲۲) ﴿وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ مُحۡدَثٍ اِلَّا كَانُوۡا عَنۡهُ مُعۡرِضِيۡنَ ﴿۵﴾﴾
(الشعراء)

’’اور ان کے پاس رحمٰن کی طرف سے کوئی نصیحت نہیں آتی مگر یہ لوگ اس سے اعراض کرنے والے ہی ہوتے ہیں۔‘‘

(۲۳) ﴿وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ (النحل)

’’اور انہوں نے ان کا انکار کیا ظلم اور سرکشی کے ساتھ جبکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کیا۔ تو دیکھ لو! کیسا ہوا انجام مفسدوں کا۔‘‘

(۲۴) ﴿تِلۡكَ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ نَجۡعَلُهَا لِلَّذِيۡنَ لَا يُرِيۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِى الۡاَرۡضِ وَلَا

فَسَادًا ؕ﴾ (القصص:۸۳)

’’یہ آخرت کا گھر تو ہم اُن لوگوں کے لیے مخصوص کرتے ہیں جو نہ تو زمین میں اقتدار و اختیار کے خواہاں ہیں اور نہ فساد مچانا چاہتے ہیں۔‘‘

(۲۵) ﴿وَقَارُوۡنَ وَفِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ ۟ وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ مُّوۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَمَا كَانُوۡا سٰبِقِيۡنَ ﴿۳۹﴾﴾ (العنکبوت)

’’اور (اسی طرح ہلاک کیا ہم نے) قارون‘ فرعون اور ہامان کو بھی‘ اور ان کے پاس آئے تھے موسیٰ واضح نشانیاں لے کر‘ تو انہوں نے زمین میں تکبر کیا‘ لیکن وہ ہماری پکڑ سے بچ کر نکل جانے والے نہیں تھے۔‘‘

(۲۶) ﴿وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسۡتَكۡبِرًا كَاَنۡ لَّمۡ يَسۡمَعۡهَا كَاَنَّ فِىۡۤ اُذُنَيۡهِ وَقۡرًا ۚ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۷﴾﴾ (لقمٰن)

’’اور جب اسے سنائی جاتی ہیں ہماری آیات تو وہ پیٹھ موڑ کر چل دیتا ہے استکبار کرتے ہوئے‘ جیسے کہ اُس نے انہیں سنا ہی نہیں‘ گویا اُس کے کانوں میں بوجھ ہے۔ تو (اے نبی ﷺ!) آپ اس شخص کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔‘‘

(۲۷) ﴿اسۡتِكۡبَارًا فِى الۡاَرۡضِ وَمَكۡرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيۡقُ الۡمَكۡرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهۡلِهٖ ؕ﴾ (فاطر:۴۳)

’’زمین میں تکبر کرتے ہوئے اور بُری چالیں چلتے ہوئے‘ اور بُری چال کا وبال نہیں پڑتا مگر اس کے چلنے والے پر ہی۔‘‘

(۲۸) ﴿اِنَّهُمۡ كَانُوۡۤا اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۳۵﴾﴾ (الصّٰفّٰت)

’’ان کا معاملہ یہ تھا کہ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو وہ استکبار کرتے تھے۔‘‘

(۲۹) ﴿بَلٰى قَدۡ جَآءَتۡكَ اٰيٰتِىۡ فَكَذَّبۡتَ بِهَا وَاسۡتَكۡبَرۡتَ وَكُنۡتَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۵۹﴾ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيۡنَ كَذَبُوۡا عَلَى اللّٰهِ وُجُوۡهُهُمۡ مُّسۡوَدَّةٌ ؕ اَلَيۡسَ فِىۡ جَهَنَّمَ مَثۡوًى لِّلۡمُتَكَبِّرِيۡنَ ﴿۶۰﴾﴾ (الزمر)

’’کیوں نہیں! تیرے پاس میری آیات آئی تھیں تو تُو نے ان کو جھٹلا دیا تھا اور تکبر کیا تھا اور تُو کافروں میں سے تھا‘ اور قیامت کے دن تم دیکھو گے اُن لوگوں کو جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا تھا کہ اُن کے چہرے سیاہ ہوں گے تو کیا جہنم ہی میں ٹھکانا نہیں ہے ایسے متکبرین کا؟‘‘

(۳۰) ﴿الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ سُلۡطٰنٍ اَتٰىہُمۡ ؕ کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ وَ عِنۡدَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ کَذٰلِکَ یَطۡبَعُ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ قَلۡبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾﴾ (المؤمن)

''جو اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر کسی سند کے جو اُن کے پاس آئی ہو۔ بڑی بیزاری کی بات ہے یہ اللہ کے نزدیک بھی اور اہلِ ایمان کے نزدیک بھی' اسی طرح اللہ مہر لگا دیا کرتا ہے ہر اُس شخص کے دل پر جو متکبر اور سرکش ہو۔''

(۳۱) ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَہَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ ﴿۶۰﴾﴾ (المؤمن)

''یقیناً وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کی بنا پر اعراض کرتے ہیں وہ داخل ہوں گے جہنم میں ذلیل وخوار ہو کر۔''

(۳۲) ﴿فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَ قَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً ؕ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَہُمۡ ہُوَ اَشَدُّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً ؕ وَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾ (حٰمٓ السجدہ)

''عاد کا معاملہ یہ تھا کہ انہوں نے زمین میں بہت تکبر کیا بالکل ناحق' اور انہوں نے کہا کہ کون ہے ہم سے بڑھ کر قوت میں' کیا انہوں نے غور نہیں کیا تھا کہ وہ اللہ جس نے انہیں پیدا کیا وہ ان سے بہت بڑھ کر ہے قوت میں! اور وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔''

(۳۳) ﴿یَّسۡمَعُ اٰیٰتِ اللّٰہِ تُتۡلٰی عَلَیۡہِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسۡتَکۡبِرًا کَاَنۡ لَّمۡ یَسۡمَعۡہَا ۚ فَبَشِّرۡہُ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۸﴾﴾ (الجاثیۃ)

''وہ سنتا ہے اللہ کی وہ آیات جو اُسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں' پھر وہ اڑ جاتا ہے ضد پر تکبر کرتے ہوئے جیسے کہ اُس نے انہیں سنا ہی نہ ہو تو آپ اسے ایک دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔''

(۳۴) ﴿وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ۟ اَفَلَمۡ تَکُنۡ اٰیٰتِیۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فَاسۡتَکۡبَرۡتُمۡ وَ کُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾﴾ (الجاثیۃ)

''اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا (ان سے اللہ پوچھے گا کہ) کیا تمہیں میری آیات پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں؟ تو تم نے استکبار کیا اور تم مجرم لوگ تھے۔''

(۳۵) ﴿قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ وَ کَفَرۡتُمۡ بِہٖ وَ شَہِدَ شَاہِدٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَلٰی مِثۡلِہٖ فَاٰمَنَ وَ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ

الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰﴾﴾ (الاحقاف)

''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے کہ کیا تم نے سوچا بھی ہے کہ اگر یہ (قرآن) واقعتاً اللہ کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا)؟ اور گواہی دے چکا ایک گواہ بنی اسرائیل میں سے ایک ایسی ہی کتاب کی۔ پس وہ تو ایمان لے آیا اور تم استکبار کر رہے ہو! بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

(۳۶) ﴿فَالۡیَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡہُوۡنِ بِمَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَفۡسُقُوۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ (الاحقاف)

''تو آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا بسبب اس تکبر کے جو تم زمین میں ناحق کرتے رہے اور بسبب ان نافرمانیوں کے جو تم کرتے رہے ہو۔''

(۳۷) ﴿وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا یَسۡتَغۡفِرۡ لَکُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ لَوَّوۡا رُءُوۡسَہُمۡ وَ رَاَیۡتَہُمۡ یَصُدُّوۡنَ وَ ہُمۡ مُّسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۵﴾﴾ (المنٰفقون)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ (اپنی غلطی مان لو) تاکہ اللہ کے رسول تمہارے لیے استغفار کریں تو وہ اپنے سروں کو مٹکاتے ہیں اور آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ رک جاتے ہیں تکبر کرتے ہوئے۔''

(۳۸) ﴿وَ اِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَ اسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ وَ اَصَرُّوۡا وَ اسۡتَکۡبَرُوا اسۡتِکۡبَارًا ﴿۷﴾﴾ (نوح)

''اور مَیں نے جب بھی انہیں پکارا تاکہ تُو ان کی مغفرت فرما دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑے بھی اپنے اوپر لپیٹ لیے اور وہ ضد پر اَڑ گئے اور انہوں نے استکبار کیا' بہت بڑا استکبار۔''

تکبّر: احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں

❁ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيمَانٍ)) (صحیح مسلم)

''جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر تکبر (گھمنڈ) ہو گا وہ جنت میں نہیں داخل ہو گا' اور جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہو گا وہ جہنم میں نہیں داخل ہو گا۔''

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ)) قَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهُ حَسَنًا، وَنَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ: ((إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ: بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ))(مسلم ،کتاب الایمان)

''جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوا وہ جنت نہیں جائے گا۔ایک آدمی کہنے لگا: بلاشبہ آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور جوتا اچھا ہو۔فرمایا:''یقیناً اللہ تعالیٰ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو محبوب رکھتا ہے۔ تکبر کا مطلب ہے: حق کو ہٹ دھرمی کے ساتھ نہ ماننا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔''

۞ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ثلاثةٌ لَا يُكلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمُ الْقِيامة ، وَلَا يُزَكِّيهِم، وَلَا ينظرُ إليهم، وَلَهُمْ عذابٌ أليم: شَيخٌ زَانٍ، وملِكٌ كذّاب، وعائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ)) (رواہ مسلم)

''تین قسم کے آدمیوں سے نہ تو اللہ تعالیٰ روزِ قیامت کلام کرے گا' نہ انہیں پاک کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور انہیں دردناک عذاب ہوگا: بوڑھا زانی' جھوٹا بادشاہ اور تکبر کرنے والا مفلس۔''

۞ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَقُولُ اللّٰهُ تَعَالیٰ: الْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي وَالْعَظَمَةُ إِزَارِي، فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ)) (رواہ مسلم)

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کبریائی (بڑائی) میری چادر اور عزّت میری ازار ہے۔ چنانچہ جو شخص ان دونوں میں سے کوئی شے مجھ سے کھینچے گا میں اسے آگ میں جھونک دوں گا۔''

۞ حضرت عیاض بن حمار ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى أَوْحَى إِلَيَّ: أَنْ تَوَاضَعُوا' حَتَّى لَا يَبْغِيَ أَحدٌ عَلى أَحَدٍ' وَلَا يَفْخَرَ أَحدٌ عَلى أَحدٍ)) (رواہ مسلم)

''اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ تواضع اختیار کرو' یہاں تک کہ تم میں سے کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور نہ ہی کوئی کسی پر فخر کرے۔''

۞ حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الجاهليةِ وفخرَها بالآباءِ، مؤمنٌ تقيٌّ، وَفَاجِرٌ شقيٌّ، أنتم بنو آدمَ وآدم مِن تراب، لَيَدَعَنَّ رجالٌ فخرَهم بأقوامٍ، إنما

هم فَحْمٌ من فَحْمِ جهنمَ، أو لَيكونُنَّ أهونَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الجِعْلَانِ الَّتِي تدفعُ بأنفها النَّتِنَ)) (سنن الترمذی)

''اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا تکبّر اور آباء و اَجداد پر فخر کرنے کی عادت کو دُور کر دیا۔(لوگ دو طرح کے ہیں) متقی مؤمن اور بدنصیب فاجر و فاسق۔تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔لوگ بالضرور اپنی اقوام پر فخر کرنا چھوڑ دیں' ورنہ وہ تو جہنم کے کوئلوں میں سے کوئلے ہیں' یا پھر وہ اللہ کے نزدیک سیاہ بھونرے سے بھی زیادہ ذلیل ہو جائیں گے جو اپنی ناک سے بدبو پھینکتا ہے (گوبر کا کیڑا جو انتہائی قبیح اور بدبودار ہوتا ہے)۔''

۞ سیدنا ثوبان ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ فَارَقَ الرُّوحُ الجسدَ وَهُوَ بَرِيءٌ مِن ثَلَاثٍ، دَخَلَ الجَنَّةَ: مِنَ الْكِبرِ والغُلولِ والدَّينِ)) (سنن الترمذی)

''جس آدمی کی روح اس کے جسم سے اس حال میں نکلے کہ وہ تین چیزوں تکبر' خیانت اور قرض سے بری ہو تو (وہ شخص) جنت میں داخل ہوگا۔''

۞ حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يُحشَرُ المتكبِّرون يومَ القيامةِ أمثالَ الذَّرِّ في صُوَرِ الرِّجالِ، يغشاهم الذُّلُّ من كلِّ مكانٍ، يُساقون إلى سجنٍ في جهنَّمَ يُقالُ له: بُولَس، تعلُوهم نارُ الأنيارِ يُسقَوْن من عُصارةِ أهلِ النَّارِ طِينةَ الخَبالِ)) (رواہ الترمذی)

''قیامت کے دن تکبر کرنے والوں کو (ان کی قبروں سے) چھوٹی چیونٹیوں کی طرح انسانی شکلوں میں اٹھایا جائے گا' ذلت نے ان پر ہر طرف سے گھیرا ڈال رکھا ہوگا۔ انہیں جہنم کے ایک قید خانہ کی طرف ہانکا جائے گا جسے ''بولس'' (جہنم کی ایک وادی کا نام) کہا جاتا ہے۔ان پر زبردست آگ مسلّط ہوگی اور انہیں اہلِ جہنّم کے زخموں کی پیپ وغیرہ پینے کے لیے دی جائے گی۔''

۞ حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ النَّارِ وَاَهْلِ الْجَنَّةِ؟ اَمَّا اَهْلُ الْجَنَّةِ فَكُلُّ ضَعِيْفٍ مُتَضَعَّفٍ اَشْعَثَ ذِيْ طِمْرَيْنِ، لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهُ، وَاَمَّا اَهْلُ النَّارِ فَكُلُّ جَعْظَرِيٍّ جَوَّاظٍ جَمَّاعٍ مَنَّاعٍ ذِيْ تَبَعٍ)) (مسند احمد)

”کیا مَیں تمہیں بتلا نہ دوں کہ جہنم والے کون ہیں اور جنت والے کون ہیں؟ ہر وہ آدمی جو دنیوی طور پر کمزور ہو' جسے لوگ کمزور سمجھتے ہوں' پراگندہ اور غبار آلودہ ہو اور دو بوسیدہ سی چادریں پہن رکھی ہوں' یہ لوگ جنتی ہیں۔ ان کا اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ مقام ہے کہ اگر ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ پر قسم اٹھا دے تو وہ ان کی قسم کو ضرور پورا کر دیتا ہے۔ اور سخت مزاج' بداخلاق' متکبّر' مال و دولت جمع کرنے والا و بخیل اور موٹا تازہ آدمی (جو از راہِ تکبّر) لوگوں سے آگے آگے چلنا پسند کرتا ہو' وہ جہنمی ہے۔“

❁ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ جرَّ ثوبه خُيَلاءَ لَمْ ينظرِ اللّٰهُ إليهِ يومَ القيامةِ)) (رواه البخاري)

”جو کوئی اپنا کپڑا اکبر و غرور اور فخر کے طور پر (زمین پر) گھسیٹے گا' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظرِ کرم نہ فرمائے گا۔“

((إنَّ في جهنَّمَ واديًا ولذلك الوادي بئرٌ يُقالُ له هَبْهَبُ، حقٌّ عَلَى اللّٰهِ أن يُسكِنَها كلَّ جَبَّارٍ)) (رواه الطبراني)

”جہنم میں ایک وادی ہے' اس وادی میں ایک کنواں ہے جس کا نام ہبہب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے کہ اس میں ان لوگوں کو ڈالے گا جو ظالم و جابر ہیں۔“

((مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَمْثُلَ لَه الرِّجالُ قِيامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)) (رواه ابوداؤد)

”جو شخص اپنے احترام میں لوگوں کے کھڑے ہونے کو پسند کرے تو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔“

تکبّر کی علامات

☆ تکبّر کرنے والے سے جب لوگ بات کرتے ہیں تو وہ اپنا چہرہ موڑ کر اور دوسروں کو حقیر سمجھ کر ان سے اعراض کرتا ہے۔

☆ تکبّر کرنے والے کی پہچان اس کے چلنے سے بھی ہوتی ہے' کیوں کہ وہ متکبرانہ چال چلتا ہے اور یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے پیچھے اس کی تعظیم و احترام کرتے ہوئے چلیں۔ نیز وہ کوشش کرتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف و دبدبہ بٹھانے کے لیے ہر وقت اس کے ساتھ محافظ اور خادم موجود ہوں۔

☆ تکبّر کرنے والا چاہتا ہے کہ وہ جب بھی کسی مجلس سے گزرے تو لوگ اس کے احترام میں

کھڑے ہوں۔ اگر کوئی بھی کھڑا نہ ہوا تو غصے کے آثار اُس کے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں۔ نیز اُس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ لوگ اس کو سلام کریں مگر وہ کسی کو سلام کرنا پسند نہیں کرتا۔

☆ تکبّر کرنے والا ہمیشہ اپنے کام دوسروں سے کرواتا ہے' یہاں تک کہ اگر پانی بھی پینا چاہے اور وہ اُس کے پاس موجود ہو تب بھی وہ خود پانی ڈال کر پینا پسند نہیں کرتا' بلکہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی خادم اس کو پانی پلائے۔

ہاں! اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی نیک بندے کو اتنی قبولیت عنایت کر دیں کہ وہ لوگوں کے ہاں اس قدر محبوب اور ہر دلعزیز ہو کہ لوگ اس کی خدمت اپنی سعادت سمجھ کر کریں تو یہ تکبّر کی علامت شمار نہیں ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝۹۶﴾ (مریم)

”یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے' عنقریب ان کے لیے رحمٰن (لوگوں کے دلوں میں) محبت پیدا کر دے گا۔“

تکبّر کے اسباب

(۱) علم انسان کو دنیا میں اس کا صحیح مقام سکھاتا ہے مگر کچھ لوگوں کو جب اللہ تعالیٰ اپنے علم میں سے کچھ علم عطا فرماتا ہے تو وہ اس پر گھمنڈ میں آ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں سارا علم بس انہی کے پاس ہے' ساری صلاحیتیں انہی کے پاس ہیں جبکہ باقی تو سب کمتر' نکمے اور جاہل لوگ ہیں۔ علم اور صلاحیتوں پر غرور کرنا بہت بڑا تکبّر ہے۔

(۲) اکثر اوقات بندہ کثیر عبادت و ریاضت کے سبب یہ گمان کرنے لگتا ہے کہ مَیں ہی سب سے زیادہ پارسا' عبادت گزار اور رب تعالیٰ کے قریب ہوں۔

(۳) جس کے پاس بہترین گاڑی' کوٹھی' بنگلہ' فارم ہاؤس' بینک بیلنس' محافظ اور کام کاج کے لیے نوکر چاکر ہوں وہ غریبوں کو حقیر نظروں سے دیکھتا ہے۔ رب تعالیٰ کی عطا کو وہ اپنی محنت' ذہنی استعداد اور منصوبہ بندی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

(۴) بندہ اپنے آباء واجداد کے بل بوتے پر اکڑتا اور گمان کرتا ہے کہ مَیں اعلیٰ ہوں جبکہ دوسرے قبیلہ و خاندان کے لوگ ادنیٰ و کمتر ہیں۔ تکبّر کی یہ بیماری ہمارے معاشرے میں بہت عام ہے۔

(۵) کچھ لوگوں کو جب حکومتی عہدے یا منصب ملتے ہیں تو وہ اپنے ماتحتوں کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں‘ جس سے ان کے اندر تکبّر پیدا ہوتا ہے۔

(۶) دنیا میں جب کسی کو پے درپے کامیابیاں ملتی ہیں تو وہ ناکام ہونے والے لوگوں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔

(۷) بندہ اپنے ظاہری حسن و جمال کے سبب بھی تکبّر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عورتیں اس مرض میں مَردوں کی نسبت زیادہ گرفتار رہتی ہیں۔ دوسروں کی شکل وصورت پر فقرے چست کرنا اور ان کا مذاق اڑانا‘ ان کے نزدیک ایک عام سی بات ہے۔

(۸) تکبّر کا ایک سبب طاقت وقوت بھی ہے۔ جس کا قد کاٹھ اچھا ہو‘ کھاتا پیتا اور سینہ چوڑا ہو یا افرادِ خانہ زیادہ ہوں تو وہ کمزور جسم اور کم افرادِ خانہ والے کو حقیر اور کمزور سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔

تکبّر کے نقصانات

☆ تکبّر ایسا گناہ ہے جو بندے کو اللہ کی طرف رجوع سے روکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے گناہ پر اصرار و مداومت اختیار کرنے لگتا ہے‘ جس کی وجہ سے اُس سے توبہ کی توفیق سلب کر لی جاتی ہے اور وہ بغیر رجوع الی اللہ کے اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ تکبّر کرنے والے کو کبھی کبھار بطورِ تنبیہ دنیا میں ہی ہلکے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے‘ تاکہ وہ سوچے‘ سمجھے اور اپنے گناہ سے باز آ جائے۔ اگر وہ اس تنبیہ سے باز نہیں آتا تو پھر اُس پر ایک بڑا عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے۔

☆ تکبّر کی وجہ سے بظاہر بڑے پارسا‘ متقی و پرہیزگار لوگوں کو معلوم بھی نہیں ہو پاتا کہ وہ رب تعالیٰ کی نظروں سے گر کر بلند رتبوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم بڑے برگزیدہ اور بلند مرتبہ ہیں۔

تکبّر کے علاج

(الف) علمی علاج: انسان جب اللہ کی دی ہوئی کسی نعمت‘ صفت یا کمال پر اپنے نفس میں بڑائی محسوس کرے تو یہ سوچ بار بار پیدا کرے کہ:

۱) میرے اندر کا یہ کمال اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ یعنی عطائی ہے اور اس کے حصول میں میرا کوئی

ذاتی عمل دخل نہیں ہے۔

۲) مَیں کسی ذاتی اہلیت کی بنا پر اس نعمت خداوندی کا مستحق نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے یہ کمال عطا فرما کر مجھے اپنی رحمت سے نوازا ہے۔

۳) اس کمال کے اللہ کی طرف سے عطا کیے جانے کے بعد اس کو باقی رکھنا میرے اختیار اور بس میں نہیں ہے‘ کسی وقت اللہ تعالیٰ اسے سلب بھی کر سکتے ہیں۔

۴) اگرچہ دوسرے شخص میں یہ کمال فی الحال نہیں ہے لیکن ممکن ہے کہ مستقبل قریب یا بعید میں اسے یہ کمال مجھ سے بھی زائد درجہ میں حاصل ہو جائے۔

۵) اس کا بھی غالب امکان ہے کہ دوسرے شخص میں کچھ ایسے کمالات ہوں جو میری نظر سے مخفی ہوں اور ان کی بنا پر اس کا رتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مجھ سے زیادہ ہو۔

۶) اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ نفس کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرے اور اپنی خامیوں و گناہوں پر نظر کرے۔

(ب) عملی علاج: انسان جس کو اپنے سے کمتر وحقیر جانے‘ اس کے ساتھ اُٹھے بیٹھے‘ کھائے‘ پیے‘ گفتگو وکلام کرے۔ اس سے دوستی کرے۔ اس کا ادب واحترام کرے۔ اس کے بارے میں اچھی سوچ سوچے۔ جب بھی اس سے آمنا سامنا ہو تو سلام میں پہل کرے۔ اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے اور اُس کی عدم موجودگی میں بھی اُس کی خامیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے صرف اُس کی خوبیوں کا تذکرہ کرے۔

☆ وہ ان آیات واحادیث پر غور کرے جن میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے تکبّر کی برائی وشناعت بیان کی ہے۔

☆ تکبّر کرنے والوں کے انجام پر غور کرے کہ وہ کیسے ذلیل ہو کر تباہ و برباد ہوئے۔

☆ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرے‘ اور ان سے اپنی اصلاح وتربیت کراتا رہے۔

☆ اپنے ذاتی کام سُنّتِ نبویؐ سمجھ کر خود کرے چاہے وہ کتنا ہی صاحبِ حیثیت ہی کیوں نہ ہو۔

☆ کلام اللہ کی وہ آیات جن میں رب تعالیٰ کی کبریائی کا بیان ہے‘ پورے فہم کے ساتھ ان کی بار بار تلاوت کرے۔

☆ اپنی گفتگو میں مجھے‘ مَیں‘ میرا‘ میری‘ میرے جیسے الفاظ استعمال نہ کرے۔

☆ اگر کوئی یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے اندر تکبر ہے یا نہیں' تو وہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنا جائزہ لے کہ کمزور طبقات کے ساتھ گفتگو میں میری سوچ اور دل کی کیا کیفیت تھی! حضرت عمر بن الخطاب ؓ کا فرمان ہے:

حَاسِبُوْا أَنفُسَكُمْ قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوْا

''حساب لیے جانے سے پہلے اپنا حساب کرلو۔''

اس سے قبل کہ اللہ تعالیٰ ہمارا محاسبہ کرے' ہمیں بار بار اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے۔ کسی بھی لمحے اپنے نفس اور شیطان کے شر' وساوس' اُکساہٹوں اور حملوں سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ تکبّر سے بچنے کی دعا کرنی چاہیے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نفس اور شیطان کے حملوں سے ہم سب کی حفاظت فرمائے اور اپنے اندر عاجزی وانکساری پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

❁❁❁

بقیہ: توکل علی اللہ کی برکات

ہماری زندگی میں ذہنی اور قلبی سکون کا بہت بڑا کردار ہے۔ ذہنی اور قلبی طور پر مطمئن شخص عموماً پُرسکون اور خوشحال زندگی گزارتا ہے۔ ''توکّل علی اللہ'' سے ذہنی وقلبی سکون اور راحت حاصل ہوتی ہے۔ اپنے تمام کاموں کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے سپرد کردیں اور اُسی ذاتِ عالی پر کامل بھروسا کریں جو بے نیاز ہے اور سب کچھ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم سب کو کامل یقین نصیب فرمائے اور متوکلین میں شامل فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں' آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

طلبہ کی کردار سازی

ڈاکٹر عامر عتیق صدیقی☆

طلبہ وطالبات کی کردار سازی والدین' اساتذہ ومعاشرہ کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اگر ابتدا ہی سے ایسے اصولوں کو اپنایا جائے جو بچوں کی عادات واطوار کی صحت کے ضامن ہوتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بچے بڑے ہو کر اچھے سیرت وکردار کے مالک نہ بن سکیں۔ کردار کے معنی چال چلن اور عادات و اطوار کے ہیں۔ انگریزی ڈکشنری میں characterان فضائل' خصوصیات کو کہتے ہیں جو ایک فرد' گروہ یا جگہ کو دوسروں سے ممتاز ومنفرد کرتے ہیں:

All the qualities and features that make a person, group of people and places different from others to have strong/weak traits.

ایک انگریزی کہاوت ہے:

If wealth is lost, nothing is lost; If health is lost, something is lost; If time is lost, a world is lost; If character is lost, everything is lost.

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (التحریم:۶)

''اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے۔''

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بچانا تو سمجھ میں آتا ہے' تاہم اہل وعیال کو کیسے بچائیں گے؟ رسول

☆ amerdcte@gmail.com

مہربان ﷺ نے جواب دیا: ''ان کی بہترین تعلیم وتربیت کر کے ان کو جہنم کی آگ سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔''

ایک دوسری جگہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے۔ قیامت کے روز ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے پوچھا جائے گا۔''

طلبہ کی تربیت ایک بنیادی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ذمہ داری سب سے پہلے والدین پر عائد ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''باپ کا اپنے بچوں کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے۔'' ایک دفعہ فرمایا: ''کوئی باپ اپنے بچے کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔''

عظیم مسلمان فلسفی امام غزالی ؒ کے الفاظ میں: ''بچوں کی تہذیب وتربیت ایک ضروری امر ہے۔ بچہ اپنے والدین کے پاس امانت ہے۔ اس کا قلب ایک نفیس تختی ہے جو ہر قسم کے نقش ونگار سے خالی ہے' ہر ایک نقش کے قابل ہے۔ اس کو جس طرف مائل کرو' مائل ہو سکتا ہے۔ بھلائی ونیکی کی تعلیم دینے کی صورت میں دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرے گا۔ برائی وبدخلقی کی صورت میں جانوروں کی طرح بے نکیل چھوڑ دیا جائے تو بدبخت اور تباہ ہو جائے گا۔ اس لیے اس تختی کو تابندہ اور درخشاں بنانے کے لیے بڑے عزم وحوصلہ' عزم واحتیاط اور صبر آزما محنت کی ضرورت ہے۔''

گھر' معاشرہ اور مدرسہ تین ایجنسیاں ہیں جہاں کی جنس بچے کو سنوارتی بھی ہے اور بگاڑتی بھی ہے۔ سخت غصیلے اور جذباتی والدین اکثر اپنے بچوں کو نشانہ غیظ وغضب بناتے ہیں۔ نتیجے میں بچے اپنے والدین سے متنفّر اور دور ہونے لگتے ہیں۔ وہ پیار ومحبت کی تلاش میں گھر سے باہر جھانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے میں ان کی دوستی آوارہ اور اخلاق باختہ افراد سے ہو جاتی ہے جو انہیں اخلاقی طور پر دیوالیہ کر دیتے ہیں۔ مفلس گھرانوں کے بچے غربت کی وجہ سے عموماً عیاش وبدمعاش اور آوارہ مزاج لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جو ان کی اجلی اور بے داغ زندگی کو بھدا اور داغدار بنا دیتے ہیں۔ جن گھروں میں والدین آئے روز جھگڑتے ہیں وہاں بچے ذہنی اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں: ؎

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ

گویا جیسی صحبت ویسے ہی بچے۔ ایسے میں والدین کے پیشِ نظر یہ ہو کہ وہ اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھیں۔ وہی بات منہ سے نکالیں جو اچھی ہو۔ بچوں کی جسمانی کفالت کے ساتھ ان کی روحانی تربیت کا بھی اہتمام کریں۔ جھوٹ کی لعنت سے بچیں۔ غیبت' چغلی اور بداندیشی سے دور رہیں۔ تحمل' بردباری اور نرمی سے کام لیا جائے۔ بات بات پر جھگڑنا چھوڑا جائے۔ ہر وقت وعظ ونصیحت کرنا بھی مناسب نہیں' اس سے بچے اثر قبول کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور ان کی غیر پسندیدہ عادات کو مشفق بن کر دور کریں۔ معتدل مزاج اور متوازن رویہ اپنانے والے ہوں۔ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں پہل کریں۔ رزق حلال کھلائیں اور اس کے لیے خاص اہتمام کریں۔ بچوں کے اساتذہ سے رابطہ استوار رکھا جائے۔ اس طرح بچے بغیر ڈانٹ ڈپٹ کے مثبت اثرات کو قبول کریں گے اور ان کی ذہنی' جسمانی وجذباتی نشوونما کے مواقع میسّر آسکیں گے۔ ؎

اجل بھی اس کی بلندی کو چھو نہیں سکتی
وہ زندگی جسے احساسِ زندگی ہو جائے

والدین کے ساتھ اساتذہ کا طلبہ کی کردار سازی میں کلیدی کردار ہے۔ اساتذہ کی اہمیت کے حوالے سے مصعب بن زبیر کہتے ہیں: ''لوگوں نے جو کچھ سیکھا ہے اس میں سے بہترین بات منہ سے نکالتے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس میں بہترین بات سیکھ لیتے ہیں۔ لہٰذا اگر تمہیں علم کی تلاش ہے تو اسے کسی کے ہونٹوں سے حاصل کرو۔ اس طرح تمہیں چیدہ اور برگزیدہ علم ہوگا۔''

امام شافعی ؒ کہتے ہیں: ''جو شخص صرف کتابوں سے علم حاصل کرتا ہے اسے وہ امتیاز حاصل نہ ہوگا جس کی اسے ضرورت ہے۔''

اخوان الصفاء کہتے ہیں: ''ہر شخص کی قوت سے باہر ہے کہ وہ صرف اپنی کوشش سے علم حاصل کرے۔ اس لیے ہر طالب علم کے لیے استاد کی ضرورت ہے جو حصولِ علم' تعمیر سیرت اور اس کے عقائد واعمال میں رہنما کا کام دے گا۔''

عباسی خلیفہ ہارون الرشید سے سوال کیا گیا: ''اللہ تعالیٰ نے دنیائے اسلام میں آپ کو بہترین درجہ عطا کیا ہے۔ کیا آپ کو اب بھی کسی چیز کی تمنا ہے؟'' خلیفہ نے جواب دیا: ''ہاں ایک مقام ایسا ہے جو سب سے بڑھ کر ہے اور جس کی برابری کوئی چیز نہیں کر سکتی' اور وہ یہ ہے کہ

کسی استاد کی مسند پر بیٹھ کر درس دیا جائے اور لوگوں کو فیض پہنچایا جائے۔‘‘

امام غزالی اساتذہ کے لیے چند اصول مقرر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ’’استاد کو چاہیے کہ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ان کے والدین کی طرح محبت کرے اور خلوص کا برتاؤ کرے۔ اسے کسی قسم کے معاوضے/تنخواہ کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ اس کو اپنے شاگردوں کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنی چاہیے۔‘‘

طالب علم پر سختی کرنے کے بجائے استاد کو چاہیے کہ وہ اپنی ناراضگی کا اظہار دوسرے ذرائع سے کردے۔ اسے چاہیے کہ وہ پہلے اپنے طلبہ کی صلاحیتوں کا اندازہ کرے اور پھر اس کے مطابق ان کو تعلیم دے۔ استاد کو اس بات کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے کہ اس کے کم ذہین شاگرد پڑھتے وقت یہ محسوس نہ کرنے پائیں کہ وہ ان کو حقیر سمجھتا ہے اور اس لیے دقیق مسائل ان کو نہیں بتاتا۔ استاد کو اپنے مضمون میں مہارت ہونی چاہیے۔ وہ باقاعدگی کے ساتھ مطالعے کا عادی ہو۔

اگر ان اصولوں پر عمل کیا جائے گا تو اساتذہ اور طلبہ کے درمیان پیدا شدہ خلا ہی پُر نہ ہوگا بلکہ طلبہ مؤدب اور بلند اخلاق بنیں گے۔ ان میں نظم وضبط‘ فرماں برداری کا احساس پیدا ہوگا۔

ماہر نفسیات لیٹر گلوئیک کے مطابق ۱۰۰ میں سے ۹۴ مجرم ایسے ہوتے ہیں جو بچپن میں سکول سے بھاگے ہوتے ہیں۔ اس کا سبب اساتذہ کا منتقم انداز‘ عدم توجہ اور روکھا پھیکا طرزِ تدریس ہوتا ہے جو بچوں کو سکول سے متنفر کرتا ہے۔

تعلیم وتربیت کے ضمن میں آج سوشل میڈیا ایک بہت بڑے ہتھیار کے طور پر سامنے آیا ہے۔ موبائل اور انٹرنیٹ نے اس وقت پوری دنیا میں اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں اور شاید ہی کوئی ہو جو اس کے نرغے سے باہر ہو۔ WHO کے مطابق اس کے کثرت اور بے ہنگم استعمال کی وجہ سے نوجوانوں میں ذہنی امراض‘ ڈپریشن‘ انگزائٹی‘ اکیلا پن‘ فرسٹریشن پیدا ہوتی ہے۔ گھر میں ہو کر بھی والدین‘ بہن بھائیوں سے رابطے کا فقدان ہوتا ہے۔ نیند کی کمی آڑے آتی ہے۔ اشتعال پسندی بڑھ رہی ہے۔ کم عمر لڑکوں/لڑکیوں کے گھر چھوڑنے کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ ذہنی صحت متاثر ہو رہی ہے۔

امریکی سرجن جنرل ڈاکٹر ویک مرتھی نے طلبہ اور نوجوانوں پر سوشل میڈیا کے اثرات سے متعلق ایک ایڈوائزری جاری کی ہے کہ نوجوانوں کی صحت کو خطرہ لاحق ہے۔ یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ سوشل میڈیا کے ماحول کو صحت مند اور محفوظ بنانے کے لیے اقدامات کیے جانے

چاہئیں۔ اس وقت ۱۳ سے ۱۷ سال کے نوجوانوں میں پچانوے فیصد تک کسی نہ کسی سوشل میڈیا پلیٹ فارم کو استعمال کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ بچپن دماغی نشوونما کے لیے اہم ہوتا ہے‘ اس لیے سوشل میڈیا کے ذریعے انہیں نقصان پہنچنے کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ سرجن جنرل نے پالیسی سازوں‘ ٹیکنالوجیکل کمپنیوں‘ محققین‘ خاندانوں اور نوجوانوں پر زور دیا ہے کہ وہ سوشل میڈیا کے اثرات کو سمجھیں۔ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کریں جبکہ نقصانات کو کم سے کم کریں۔ بچوں کے لیے زیادہ محفوظ اور صحت مند آن لائن ماحول تشکیل دیں۔

بچوں کو سوشل میڈیا پر ایسے مواد سے واسطہ پڑتا ہے جو پُرتشدد اور جنسی ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے بہت سے بچے نیند پوری نہیں کر سکتے۔ جو وقت انہیں والدین‘ دوستوں کے ساتھ گزارنا ہے وہ سوشل میڈیا کی نذر ہو جاتا ہے۔ جو بچے تین گھنٹے سے زائد سوشل میڈیا پر گزارتے ہیں ان کے لیے ذہنی امراض میں مبتلا ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ ایک ریسرچ کے مطابق جو بچے کھیل کے میدان میں نہیں جاتے اور موبائل کا استعمال کرتے رہتے ہیں وہ وقت سے پہلے بڑے ہو جاتے ہیں۔

آج حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ والدین اپنے بچوں کی صحت مند سرگرمیوں اور مصروفیات کے لیے منصوبہ بندی کریں۔ انٹرنیٹ پر موجود منفی مواد کی خبر رکھیں۔ اس کے مثبت استعمال کو رواج دیں۔ سوشل میڈیا پر سائنس کے حوالے سے ہر زبان میں اور ہر سطح کے لیکچرز موجود ہیں۔ بچوں کی تعلیم‘ conceptual learning اور بہتر تفہیم کے لیے ان کو اس طرف راغب کیا جائے۔

ترکی کے صدر رجب طیب اردگان نے الیکشن جیتنے کے بعد اپنی قوم کے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے جن زریں خیالات کا اظہار کیا ہے‘ وہ پوری امت کے نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ گناہ اور جھوٹ سے بچو۔ توبہ میں تاخیر نہ کرو۔ نماز کو بالکل درست طریقے سے پڑھو۔ سلام کو اور دعا کو اہمیت دو۔ چہرے پر مسکراہٹ سجاؤ۔ عاجزی سے چلو۔ چلا کر مت بولو۔ جاہل اور برے ہمسائے سے دور رہو۔ تمام کاموں میں مشاورت کرو‘ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اچھے دوستوں کا انتخاب کرو۔ علمی مجالس میں شرکت کرو۔ سست نہ بنو اور نہ ہی جلد باز بنو۔ صبح جلدی اٹھو۔ تھوڑا بولو اور غلط بات مت پھیلاؤ۔ شفقت والا رویہ اپناؤ اور فراخ دل بنو۔ جب کوئی مصیبت آئے تو صبر کرو کیونکہ جس نے صبر کیا وہ کامیاب ہوا۔ ۞۞۞

جنّتی کون دوزخی کون؟

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والے اعمال پر جنّت کی بشارت ہے جبکہ اس کی نافرمانی کرنے والوں کو دوزخ کی وعید ہے۔ عموماً یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص چونکہ بہت اچھے اعمال کرتا ہے لہٰذا اُس کا انجام بخیر ہوگا جبکہ فلاں آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے لہٰذا وہ دوزخ میں جلے گا۔ انسانوں کے مشاہدے پر مبنی اس قسم کے فیصلے صد فیصد صحیح نہیں ہوتے۔ انسان تو دوسروں کے صرف ظاہری اعمال دیکھتا ہے‘ اسے کسی کے باطن کی خبر نہیں ہوتی جبکہ آخرت میں کامیابی اور ناکامی انسان کے باطن یعنی ایمان کی بنیاد پر ہوگی۔ یہ ہماری کم فہمی ہے کہ نماز‘ روزے میں مشغول شخص کو خدارسیدہ سمجھ لیتے ہیں اور اُس کے عقیدت مند ہو جاتے ہیں۔ البتہ حسن ظن کے اعتبار سے یہ رویہ کسی حد تک درست ہے‘ کیونکہ ہم کسی انسان کی نیت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اسے تو صرف عالم الغیب ہی جانتا ہے‘ یا پھر جس کے بارے میں وہ رسول اللہ ﷺ کو خبر دے دے۔ ظاہریت پر انجام کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

کوئی شخص اگر موت کے وقت اس حال میں تھا کہ اللہ تعالیٰ اُس سے راضی تھا تو وہ جنّت میں جائے گا اور اگر اس حال میں مرا کہ وہ اللہ کا نافرمان تھا تو اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔ یہ علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے جس کو نام لے کر جنتی فرمایا بے شک وہ جنتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بتانے سے رسول اللہ ﷺ نے کسی کو جنتی بتایا ہے تو وہ بلاشبہ جنتی ہے اور جس کو جہنمی بتایا گیا ہے وہ جہنمی ہے۔ اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ کے علاوہ نیکوکاروں کے بارے میں کوئی شخص بھی ان کے جنتی ہونے کا حکم نہیں لگا سکتا۔ اسی طرح بدکرداروں کے آخرت کے انجام کا علم بھی کسی انسان کے پاس نہیں۔ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ ظاہر سے متاثر ہو جاتا ہے اور حقیقتِ حال جاننے کے لیے کوشش نہیں کرتا۔ اسلام کامل دین ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بصیرت یعنی قرآن وحدیث سے راہنمائی لی جائے تو صراطِ مستقیم مل جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کو نام بنام

جنتی اور کچھ کو نام بنام دوزخی بتایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ کسی کو نہ یقینی طور پر جنتی کہا جا سکتا ہے نہ دوزخی۔ ہاں کسی کے بارے میں حسنِ ظن یا سُوءِ ظن رکھا جا سکتا ہے!

قرآن وحدیث میں اس وضاحت کے باوجود کہ کسی کے جنتی یا جہنمی ہونے کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں‘ لوگوں نے اپنے مشاہدے یا علم کی بنا پر کچھ لوگوں کو جہنمی یا جنتی سمجھ لیا ہے۔ چونکہ انبیاء ورُسل علیہم السلام کے سوا بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہونے کا سرٹیفکیٹ کسی کے پاس نہیں‘ لہٰذا کسی کو ایسی خصوصیت کا حامل قرار دینا درست نہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتے ہیں۔ کچھ لوگ نیک لوگوں کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ بھی ان کی بخشش کا وسیلہ بن سکتے ہیں حالانکہ وہ بزرگ خود ساری زندگی اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِي کہتے رہے ہوتے ہیں۔

عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ غیب کی جو خبریں رسول اللہ ﷺ نے دی ہیں وہ بھی اللہ کے بتانے ہی سے دی ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴﴾ (النجم) ”وہ (یعنی محمد ﷺ) اپنی خواہشِ نفس سے منہ سے بات نہیں نکالتے۔ بلکہ وہ تو وہی بتاتے ہیں جو اُن پر وحی کی جاتی ہے“۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کون جنتی ہے اور کون دوزخی! کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کے بارے میں جنت یا دوزخ کا حکم لگا سکے۔ اس کے لیے کئی دلائل دیے جا سکتے ہیں مگر یہ آیت ہی ساری حقیقت واضح کر دیتی ہے کہ: ﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (البقرۃ:۲۸۴) ”وہ جسے چاہے اُسے بخشے جسے چاہے عذاب دے“۔ بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی بظاہر حالات جس کو جنتی سمجھا‘ آپ ﷺ نے اس کے جہنمی ہونے کی خبر دی۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اَهْدٰى رَجُلٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ غُلَامًا يُقَالُ لَهُ مِدْعَمٌ ، فَبَيْنَمَا مِدْعَمٌ يَحُطُّ رَحْلًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَصَابَهُ سَهْمٌ عَائِرٌ فَقَتَلَهُ ، فَقَالَ النَّاسُ: هَنِيْئًا لَهُ الْجَنَّةُ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((كَلَّا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّ الشَّمْلَةَ الَّتِيْ اَخَذَهَا يَوْمَ خَيْبَرَ مِنَ الْمَغَانِمِ لَمْ تُصِبْهَا التَّقَاسِمُ لَتَشْتَعِلُ عَلَيْهِ نَارًا)) فَلَمَّا سَمِعَ ذٰلِكَ النَّاسُ جَاءَ رَجُلٌ بِشِرَاكٍ اَوْ شِرَاكَيْنِ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ ، فَقَالَ: ((شِرَاكٌ مِنْ نَارٍ اَوْ شِرَاكَانِ مِنْ نَارٍ)) (متفق علیه)

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں

بطور ہدیہ ایک غلام پیش کیا جس کو ’’مدعم‘‘ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ ایک دن رسول اللہ ﷺ کی سواری سے ایک کجاوہ اتار رہا تھا کہ اچانک اس کے ایک تیز تیر آ کر لگا‘ جس سے وہ مر گیا۔ یہ سن کر لوگوں نے کہا کہ اس کو جنّت مبارک ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’ہرگز نہیں‘ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے‘ بے شک وہ اُونی چادر جو اُس نے خیبر کے دن غنیمت سے لی تھی اور وہ اس کے حصہ میں نہیں آئی تھی‘ اس پر آگ بھڑک رہی ہے۔ لوگوں نے جب آپ کی یہ بات سنی تو ایک شخص ایک یا دو تسمے لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’آگ کا ایک تسمہ ہے یا آگ کے دو تسمے ہیں۔‘‘

لوگ تو اس کی موت کو مبارک سمجھ رہے تھے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ وہ تو آگ میں جھلس رہا ہے۔ اسی طرح خیبر کی جنگ میں شامل کچھ لوگوں نے بتایا کہ فلاں شخص بھی شہید ہوا ہے۔ جب آپ ﷺ نے سنا تو اُسے جہنمی بتایا۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت عمرؓ نے بیان کیا:

لَمَّا كَانَ يَوْمُ خَيْبَرَ اَقْبَلَ نَفَرٌ مِنْ صَحَابَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالُوْا : فُلَانٌ شَهِيْدٌ ، حَتّٰى مَرُّوْا عَلٰى رَجُلٍ فَقَالُوْا : فُلَانٌ شَهِيْدٌ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:((كَلَّا اِنَّمَا رَاَيْتُهٗ فِي النَّارِ، فِيْ بُرْدَةٍ غَلَّهَا اَوْ عَبَاءَةٍ)) ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :((يَا ابْنَ الْخَطَّابِ اِذْهَبْ فَنَادِ فِي النَّاسِ اِنَّهٗ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ ثَلَاثًا)) قَالَ : فَخَرَجْتُ فَنَادَيْتُ اَلَا اِنَّهٗ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ ثَلَاثًا (رواه مسلم)

’’جس دن خیبر کی جنگ تھی‘ آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ کی ایک ٹولی آئی اور کہنے لگی کہ فلاں شہید ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک شخص کے پاس سے گزرے‘ تو دیکھ کر کہا کہ فلاں بھی شہید ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’ہرگز نہیں‘ مَیں نے تو اس کو دوزخ کی آگ میں جلتا ہوا دیکھا ہے‘ اس چادر کی وجہ سے یا عبا کی وجہ سے جس کو اُس نے مالِ غنیمت سے چُرا لیا تھا‘‘۔ پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: ’’اے ابن الخطاب! جاؤ اور ان لوگوں میں اعلان کر دو کہ جنّت میں صرف مؤمن داخل ہوں گے‘ تین مرتبہ یہ اعلان کرو‘‘۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ مَیں نکل کر گیا اور مَیں نے پکار کر کہہ دیا کہ سن لو! کہ جنت میں مؤمن کے سوا اور کوئی داخل نہیں ہوگا‘ یہ مَیں نے تین مرتبہ کہا۔‘‘

پس کسی شخص کے ظاہری کارناموں کی وجہ سے اسے جنتی بتانا یقینی نہیں کیونکہ اس حوالے سے حتمی علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ فلاں شخص بہت نیکوکار ہے تو وہ اس کے عقیدت مند ہو جاتے ہیں لیکن اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے۔

کسی شخص کو اپنے حسنِ عمل پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے بلکہ خاتمہ بالخیر کی دعا کرتے رہنا چاہیے‘ کیونکہ انجام تو ایمان پر موت آنے پر منحصر ہے۔ اسی طرح کسی شخص کو اپنے بداعمال ہونے کی وجہ سے مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر وقت اپنی بخشش کی دعا مانگتے رہنا چاہیے اور حسنِ خاتمہ کا سوال کرتے رہنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم ہے کہ نیک عمل کرتے رہو مگر ہر وقت اللہ کی رحمت کے طلب گار بھی رہو‘ کیونکہ اس کے بغیر کسی کا کوئی نیک عمل اسے جنتی نہیں بنا سکتا۔

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَنْ يُنْجِيَ اَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهٗ)) قَالُوْا: وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ؟ قَالَ:((وَلَا اَنَا، اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ، فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاغْدُوْا وَرُوْحُوْا وَشَيْءٌ مِنَ الدُّلْجَةِ، وَالْقَصْدَ اَلْقَصْدَ تَبْلُغُوْا))(رواه البيهقي)

’’تم میں سے کسی کو بھی صرف اس کا عمل آخرت میں نجات نہیں دے گا‘‘۔ لوگوں نے تعجب سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ کو بھی؟ فرمایا: ’’ہاں مجھ کو بھی‘ بجز اس صورت کے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنی رحمت میں گھیر لے۔ لہٰذا میانہ روی کے ساتھ عمل کرتے رہو اور زیادہ بلند پروازیاں نہ کرو۔ پس کچھ صبح و شام کچھ شب کی تاریکی میں‘ میانہ رفتار کے ساتھ چلتے رہو‘ منزل مقصود کو جا پہنچو گے۔‘‘

رسول اللہ ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خواست گار رہیں۔ ہمیں حضور ﷺ پر درود پڑھنے کا حکم ہے۔ درود میں ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپؐ پر رحمتیں بھیجے۔ رسول پاک ﷺ کے لیے رحمت کی یہ دعا ہمارے لیے بھی بے حد اجر و ثواب کا باعث بنتی ہے۔

سورۃ الاعراف میں ایک شخص کا ذکر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا علم دیا۔ وہ شخص جسے بلعم بن باعورا کہا جاتا ہے‘ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس فضیلت کو سنبھال نہ سکا اور نتیجتاً گمراہی کی موت مر گیا۔ اس سے ہمیں یہی تعلیم ملتی ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دعا کرتے رہنا چاہیے اور کسی وقت بھی اپنے کسی نیک عمل کو اپنی کامیابی کا ذریعہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ نیک عمل صرف وہی ہے جو موت سے پہلے پہلے صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت بے حد و حساب ہے۔ انتہائی گناہ گار شخص بھی اگر توبہ کر لے اور گناہ چھوڑ دے تو اس کی بخشش ہو جائے گی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۵۳﴾ (الزمر)

’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا‘ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف فرما دے گا۔ یقیناً وہ بہت بخشنے والا‘ نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

مایوسی تو سراسر گناہ ہے۔ اگر کسی شخص نے پوری زندگی اللہ کی نافرمانی میں گزاری ہو اور موت سے پہلے گناہوں سے تائب ہو جائے تو اللہ کی رحمت سے اس کے تمام گناہ مٹ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ستر ہزار لوگوں کو بے حساب جنت میں داخل کرے گا اور اس کے علاوہ ہزارہا دوسروں کو بھی معاف کر دے گا‘ تبھی تو جنت میں داخل ہوں گے۔ نیکوکاروں کو اپنے نیک اعمال کے نتیجے میں جنّت میں جانے کا یقین ہونے کے بجائے امید رکھنی چاہیے۔ اسی طرح بداعمال لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

کتنے ہی لوگ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے حینِ حیات فوت ہوئے۔ آپ ﷺ نے ان کو دفن کیا‘ لیکن کسی کی قبر پختہ نہ بنائی بلکہ اس سے منع کیا۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان کتب حدیث میں موجود ہے۔ اس کے باوجود آج مسلمانوں کی کثیر تعداد اپنے پسندیدہ افراد کی قبریں پختہ بناتے اور ان پر عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔ یہ کام رسول اللہ ﷺ کے حکم کی سراسر نافرمانی ہے۔ پھر ان قبروں میں دفن لوگوں کو اپنے زعم میں خدا رسیدہ مان لیا جاتا ہے‘ حالانکہ ان کی حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں اپنی ضرورتوں کے لیے پکارا جاتا ہے جب کہ وہ خود ساری زندگی اللہ تعالیٰ کے سوالی رہے۔ اپنے لیے رحمت مانگتے رہے اور دوسروں کو یہی تعلیم دیتے رہے۔ یہ تو نری جہالت ہے کہ کسی مقبرے میں دفن شخص کو جنتی مان لیا جائے اور اسے اپنی حاجتوں کے لیے پکارا جائے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آخرت میں اللہ کے حضور ہر شخص کا انفرادی طور پر حساب کتاب ہو گا‘ جس کے نتیجے میں وہ جنّت میں جائے گا یا اس کا ٹھکانا دوزخ ہو گا۔ قرآن مجید میں اس ضمن میں کئی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ ❁❁❁

اسکوفیلڈ بائبل

رضی الدین سیّد☆

عام مقدّس انجیلوں سے ہٹ کر ’’اسکوفیلڈ‘‘ ایک نسبتاً جدید بائبل ہے جو جنگ عظیم اوّل کے چند سال بعد شائع کی گئی تھی۔ اس کے مرتب کا نام اسکوفیلڈ (Scoofield) تھا۔ اُس نے بائبل میں موجود پیشین گوئیوں کو سامنے رکھ کر دنیا کی پیدائش سے اس کے آخری انجام تک ہونے والے تمام واقعات کی تشریح کی تھی۔ متن کے تصریحی حاشیے دیے جانے کے علاوہ اس میں حوالے کے لیے دوسری انجیلوں کے متن بھی دیے گئے ہیں۔ بائبل (عہد نامہ قدیم) کو دراصل ریاست اسرائیل کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے۔ اسکوفیلڈ نے واضح کیا تھا کہ تخلیق کے بعد سے روزِ قیامت تک بہت بڑے بڑے واقعات رونما ہوں گے۔ اسی لیے اسرائیل کے قیام کے بعد عیسائی دنیا میں بھی اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اور اس کا رواج عام ہونے لگا تھا۔ اس پر آمنّا وصدّقنا کہنے والے آج خود کو Dispensialists اور Evengilicals کے نام سے پکارتے ہیں‘ امریکہ میں جن کی کثرت ہے۔

زیر نظر بائبل کی تشریح کے لحاظ سے ریاست اسرائیل کا قیام لازمی امر تھا جو ایک ’’وعدۂ الٰہی‘‘ ہے۔ انجیلوں میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے ابراہیمؑ سے کہا: ’’جو لوگ تجھے برکت دیں گے انہیں میں بھی برکت دوں گا۔‘‘ (عہد نامۂ قدیم: پیدائش‘ باب ۱۲‘ آیت ۳)۔ اسکوفیلڈ نے اس آیت کی رو سے قرار دیا کہ بنی اسرائیل کے لیے ایک الگ ریاست کا قیام لازمی ٹھہرتا ہے۔ جو اس کے لیے بھاگ دوڑ اور حمایت کرے گا‘ اللہ اسے برکت دے گا۔ چنانچہ انہی ایونجلسٹوں کی تحریک کے باعث امریکی عیسائی یہودیوں کے حامی‘ جبکہ مذکورہ الٰہی وعدے کے مخالف مسلمان قوم کے دشمن بن چکے ہیں۔ وہ یہودیوں سے بھی زیادہ اسرائیل کے استحکام کے خواہاں

☆ای میل: national.a.research@gmail.com

ہیں‘ اوراس مقصد کے لیے لاکھوں ڈالر کے عطیات اسرائیل بھیجتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض امریکی صدور جیسے ٹرومین‘ جانسن‘ ریگن اور جارج بش وغیرہ عربوں کے خلاف اسرائیل کے موقف کے داعی نظر آتے ہیں۔ اسی باعث اسرائیل بھی انہی عیسائی ایونجلسٹ شخصیات کو اپنے ہاں بار بار دورے کرواتا ہے تاکہ فلسطین کے مکمل حصول کے لیے وہ مزید زور شور سے آواز بلند کریں۔ صہیونیوں کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کی جان کے ازلی دشمن ہی اب ان کے حمایتی و مددگار بن کے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں!

بعد میں بھی اسکوفیلڈ کی اس انجیل پر حاشیے بڑھائے جاتے رہے۔ جنگِ عظیم دوم کے دور میں چونکہ پریس ایجاد ہو چکے تھے‘ نیز حاشیوں والی اس بائبل کی زبان عام انجیلوں کی زبان سے نسبتاً آسان تھی‘ اس لیے یہ بائبل ازخود مقبول ہوتی چلی گئی۔ کوئی عیسائی جب عہد نامہ قدیم سے اپنی مذہبی تعلیم شروع کر کے (یہودیوں کی یہ انجیل عیسائیوں کے لیے بھی یکساں مذہبی اہمیت رکھتی ہے‘ کیونکہ وہ حضرت موسیٰؑ کو بھی اپنا پیغمبر گردانتے ہیں) اسکوفیلڈ بائبل کا مطالعہ کرتا ہے تو ابتدائے عمر ہی میں وہ یہودیوں کے نقطۂ نظر کا اسیر ہونے لگتا ہے۔ مشینی خوبصورت چھپائی کے باعث اس پر تحریر کردہ حاشیے اور وضاحتیں زیادہ پُرکشش لگتے تھے۔ انہیں پڑھتے پڑھتے عیسائی اپنے آباء واَجداد کے تصورات کے برعکس یہودیت کو ایک سچا دین سمجھنے لگے۔ یہ سلسلہ آج بھی پیہم جاری ہے۔ اسکوفیلڈ نے امریکی ذہنوں کو تبدیل کر دیا ہے‘ اور ان کی اکثریت اب اسرائیل کے قیام پر پختہ ایمان رکھتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ: ’’خطۂ فلسطین عربوں کا وطن نہیں بلکہ محض خدا کی منتخب کردہ قوم یہودیوں کا وطن ہے‘‘۔ عیسائیوں کا حالیہ نظریہ "Rapture" بھی کہ قیامت سے پہلے تمام عیسائی آسمان پر اٹھا لیے جائیں گے اور وہ جنّت کی آرام گاہوں میں بیٹھے زمین پر عیسیٰؑ اور کافروں کے درمیان برپا ہونے والی بھیانک جنگ ’’آرمیگاڈان‘‘ کا نظارہ کریں گے جب کہ خود کو مرنے اور کٹ جانے سے محفوظ رکھ سکیں گے‘ دراصل اسی اسکوفیلڈ بائبل کا کرشمہ ہے۔

حد سے زیادہ پزیرائی کے باوجود اس بائبل کے بارے میں عیسائیوں میں بہت تحفظات بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک صہیونی چال ہے جس کے ذریعے عیسائیوں کو یہودی نواز اشتراکی نظریات کا ہمنوا بنایا جا رہا ہے‘ اور ان میں یہ نظریہ فروغ دیا جا رہا ہے

کہ: ’’خدا اسرائیل کی ریاست کی حمایت کا طلب گار ہے۔‘‘ ان کے علاوہ‘ وہ اس کتاب کے نام پر لوگوں کو بے دینی کی طرف راغب کر کے چرچ سے ان کا رشتہ بھی کمزور کر رہے ہیں۔ عیسائیوں کو کہا جا رہا ہے کہ چرچ اور پادری اپنے شرعی فرائض صحیح طور پر انجام نہیں دے رہے‘ اس لیے حضرت عیسیٰؑ خود آ کر ہی تمام امور انجام دیں گے۔ بعض حلقوں کے مطابق‘ مصنف کے پیچھے یقیناً کچھ ایسے لوگ تھے جو امریکی عیسائیوں کو پروٹسٹنٹس بنا رہے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسکوفیلڈ ایک یہودی تھا جس نے بعد میں عیسائیت قبول کر لی تھی۔ کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے اس کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تھی۔

امریکی مصنفہ اور وہائٹ ہاؤس کی تقریر نویس گریس ہال سیل اپنی کتاب میں اس بائبل کے ضمن میں تفصیل دیتی ہے کہ:

’’......اسکوفیلڈ نظریے کے حامیوں کی تعداد امریکہ میں بڑھتی جا رہی ہے۔ امریکہ میں غالباً ۸۰ ہزار بنیاد پرست پادری موجود ہیں۔ ٹی وی کے بیشتر مقررین اسکوفیلڈ کے نظریے کا پرچار کرتے ہیں جبکہ بڑی اور بااثر تعلیم گاہیں وہاں ڈسپینشلسٹ عقیدے کی تعلیم دیتی ہیں۔ اسکوفیلڈ میں کئی صدیوں کے رجحانات کو نہایت مؤثر انداز سے یکجا کیا گیا ہے جس کی اہمیت کو جتنا بھی بیان کیا جائے‘ کم ہے۔ اس زمانے میں اسکوفیلڈ نے بائبل میں اپنے خیالات شامل کر کے مذکورہ نظریے کی مقبولیت پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔

عادی بادہ نوش اسکینڈلز کے شکار‘ اوائلِ عمری میں ازدواجی الجھنوں سے دوچار اسکوفیلڈ نے ایک بیوی اور دو بچے خود سے علیحدہ کر دیے تھے۔ اسے سینٹ لوئی میں جعل سازی کے الزامات کے تحت ۱۸۷۹ء میں جیل کی سزا بھی ہوئی تھی۔‘‘

اسکوفیلڈ بائبل کی کمزوریاں

گریس ہال سیل کے مطابق اس بائبل میں کئی کمزوریاں بھی ہیں:

(۱) یہ مسیح اور مسیحیت کے معنی کی نفی کرتی ہے۔ یعنی یہودیوں کو خدا کی پسندیدہ قوم تسلیم کرتی ہے۔

(۲) مسیحیت کو یہودیوں کا یرغمال بناتی ہے‘ خواہ وہ کچھ بھی کرتے رہیں۔

(۳) عیسیٰؑ کو نہیں بلکہ یہودیوں اور اسرائیل کو مرکزی حیثیت دیتی ہے۔

(۴) یہ خدا کو ہدایت دیتی ہے کہ وہ مبشراتی عیسائیوں یا یہودیوں کو سربلند کرے۔

(۵) اس کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے وعدے زمین پر صرف اس کے منتخب بندوں کے لیے ہیں۔

(۶) اسکوفیلڈ Rapture کا نظریہ سکھاتی ہے‘یعنی اس کے پیروکار دوزخ سے بالکل دُور رہیں گے۔

(۷) یہ سکھاتی ہے کہ عیسیٰؑ خود بھی یہودی بادشاہت قائم کرنے کے لیے دنیا میں آئیں گے۔

(۸) امریکی مبشراتی مبلغ جیری فال ویل کی تقاریر کی رو سے ہر عیسائی کو چاہیے کہ اسرائیل کی حمایت کرے‘اور اگر ہم نے اسرائیل کو تحفظ دینے میں ناکامی دکھائی تو خدا کے آگے ہم اپنی اہمیت کھو دیں گے۔

مصنفہ سابق صدر جمی کارٹر کے اس بیان کا حوالہ دیتی ہے کہ:’’۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے جنم کے معنی یہی ہیں کہ یہودی‘ جنہیں کئی سال پہلے نکال دیا گیا تھا‘اب بائبل کی سرزمین پر واپس آگئے ہیں۔اسرائیل کا قیام درحقیقت بائبل کی پیش گوئی کی تکمیل اور بائبل کے بیان کا حاصل ہے۔‘‘ گریس ہال سیل نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ:’’اسکوفیلڈ ریفرنس بائبل میں یہ بات واضح طور پر بتائی گئی ہے کہ خدا کو صرف دو قوموں سے دلچسپی ہے:ایک یہودی اور دوسری عیسائی!‘‘

امریکہ میں اسرائیل سے جو شدید محبت پیدا ہوئی ہے‘اس میں دیگر عوامل کے ساتھ ’’اسکوفیلڈ حوالہ جاتی بائبل‘‘ کا بھی بڑا ہاتھ ہے‘جس نے عیسائی پادریوں کو بھی اپنے پیغمبر کے قاتلوں کا جرم بھلا کر انہی کا ہمنوا بنا دیا ہے۔ایک اعتبار سے وہ اب یہودیوں سے بھی بڑھ کر یہودی ہوگئے ہیں۔شاید اسی لیے بیشتر امریکی صدور اسرائیل کی حمایت اور فلسطین کی بربادی پر متفق ہیں۔

حوالہ جات

(۱) گوگل سرچ:انسائیکلوپیڈیا کولنس۔عنوان:اسکوفیلڈ بائبل

(۲) کتاب’’جدید صلیبی جنگ‘‘از گریس ہال سیل‘ترجمہ رضی الدین سید

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اگر مَیں نے اس جدّوجُہد میں حصہ نہیں لیا تو روزِ محشر مجھے کیا اجر ملے گا؟اس کے برعکس اگر آپ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں‘اور اس جماعت سے مل کر ہر ممکن کوشش کرتے ہیں جس کے بارے میں آپ کا خیال ہے کہ یہ اسلام کے نفاذ کے بارے میں مخلص ہے‘تو اسلام چاہے آئے نہ آئے لیکن آپ کی آخرت سنور جائے گی۔یعنی آپ کی فلاح یقینی ہے۔یہ سوچنا ٹھیک نہیں کہ ہمارے کرنے سے کیا ہوگا!اصل میں یہ آپ ہی کے کرنے کا کام ہے۔جب تک ہر مسلمان اس کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا تب تک اسلام کے نفاذ کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔اس لیے ہر شخص کو اپنی ذمہ داری لینی ہوگی کیونکہ آخرت میں ہر ایک سے پوچھ ہوگی۔اللہ تعالیٰ یہ نہیں پوچھے گا کہ تمہارے ملک میں اسلامی نظام کیوں نہیں نافذ ہوا تھا۔وہ پوچھے گا:تم نے کیا کیا تھا؟ اس حوالے سے تمہارا عمل کیا تھا؟لہٰذا جواب اپنا دینا پڑے گا۔اللہ تعالیٰ کسی پر وہ بوجھ نہیں ڈالتا جو وہ اُٹھا نہ سکے۔آپ کسی عالم دین کی‘ کسی مقرر کی‘ کسی قومی لیڈر کی تقریر سنتے ہیں اور واہ واہ کرتے ہیں تو اس سے آپ کا حق ادا نہیں ہوجاتا۔سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ کو سمجھ آگئی ہے کہ یہ بات دین ودنیا کے حوالے سے درست ہے اور پھر بھی آپ اس کی حمایت میں کھڑے نہیں ہوتے تو معاف کیجیے‘ آپ کا جرم بڑھ جاتا ہے۔

❁❁❁

ماھنامہ ’’میثاق‘‘ لاھور

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان‘ایک علمی‘ دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربیّین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات اور ہر گھر وفرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست‘ احباب اور اعزّہ واقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

Sep. 2023
Vol.72

Regd. CPL No. 115
No.9

Monthly **Meesaq** Lahore

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے

سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہجِ انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل

اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک'

اسلامی انقلاب کے مراحل' مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

(جدید نظرثانی شدہ ایڈیشن)

❁ صفحات: 360 ❁ قیمت اشاعت خاص: 750 روپے ❁ اشاعت عام: 500 روپے

❁❁❁

"منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

❁ صفحات: 64 ❁ قیمت اشاعت خاص: 125 روپے ❁ اشاعت عام: 60 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501